ماہنامہ

ترجمان القرآن

اگست ۹ء

جاری کردہ :

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل: ۵۳۴۰

جلد ۱۱۳ اگست ۱۹۹۰ء - محرّم الحرام ۱۴۱۱ھ عدد ۶

فہرست مضامین

رابطہ وترسیلِ زر کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر: ۳۲۴۴۶۸ - ۶۸۶۳۶ پوسٹ بکس نمبر: ۱۳۴۳

فی پرچہ: ۶ روپے زرِسالانہ: ۶۰ روپے

سیّد حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ساہوکارانہ سامراج نے غلامی کی ایک تازہ زنجیر ہماری گردنوں کے گرد لپیٹنے کا فیصلہ کرلیا ہے، بلکہ حکومت کو منوا کر عملی اقدام بھی شروع کرا دیا ہے۔ ہماری جمہوریت نے اس کارِ خیر پر اپنے معزز و مؤقر غلام سازوں کے ہاتھ پاؤں چوم کر بہ صد تشکر قوم کی گیارہ کروڑ گردنیں آقائے عظیم کے سامنے جھکا دی ہیں کہ ان گردنوں کے گرد جو پھندا بھی کسنا ہو اور جو نشتر بھی رگہائے جان کے قریب فٹ کرنے ہوں، کرلیجیے۔ "کوئی کس کی اور گہنے کس کے"! (یعنی کنیز بھی آپ کی اور گہنے بھی آپ کے!) بلکہ گہنوں کی جگہ آپ طوق بھی پہنا دیں تو کنیز تو پھر بھی بصد ادب آپ کی سلامتی کی دعائیں کرے گی "تم سلامت رہو ہزار برس - ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار"

ہم اس درجے کے بے مثال محسن شناس ہیں۔

ہوا یہ کہ اوپر کی دنیا میں جہاں پُراسراریت کے بادل چھائے رہتے ہیں، وہاں ہمارے بڑوں اور ان کے بڑوں کے درمیان بات چیت پاکستان کے تعلیمی حالات پر ہوئی۔ خرابیٔ احوال کے مختلف نمایاں پہلو بحث میں آئے۔ ہمارے جدید غلام ساز تو پہلے سے منصوبے ذہن میں لے کر آئے تھے۔ یہاں انھوں نے محض تعلیمی زوال اور پسماندگی کی بحث چھیڑی۔ ہمارے جمہوری مالکوں نے ساہوکار سامراجیوں سے یہ کہا کہ کچھ آپ ہی اس بارے میں جائزہ و تحقیق سے کام لے کر نقشۂ اصلاح تجویز کر دیجیے، ہم لوگ تو اور بہت اعلیٰ درجے کے جھمیلوں میں گلے گلے تک دھنسے ہوئے ہیں۔ اور ہمیں تو اس ایک کام سے فرصت نہیں کہ اپنے آپ کو اور اپنے جاہ و جلالت کو بچایا جائے۔

اِس طرح ورلڈ بنک کی ڈیوٹی لگی کہ وہ پاکستان کے تعلیمی حالات کا سروے کرے۔ ورلڈ بنک نے کام کی وسعت کو دیکھ کر اپنے ساتھ آئی، ایم، ایف کو بھی لگا لیا جسے انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ کہتے ہیں۔ دونوں "امریکی۔ مغربی۔ اسرائیلی" سامراج کے چینے کے اگلے دو پنجے ہیں۔ سامراج کی مہارتِ فن ہے کہ ان بنکوں کو تعلیمی جائزے اور سروے اور تجاویزِ اصلاح مرتب کرنے کی دعوت خود ہماری حکومت کی طرف سے دلوائی گئی۔ فروری، مارچ ۸۹ء میں یہ کام ہوا۔ پنجاب کے اندر سروے کا کام خود ورلڈ بنک نے کیا۔ اور پنجاب سے باہر کے پاکستان میں آئی۔ ایم۔ ایف نے کیا۔ اِس تقسیم میں بھی ایک خاص ذہنیت کام کر رہی ہے اور وہ پنجاب کی حیثیت کو جداگانہ نوعیت دیتے ہیں، کیونکہ یہ تو ہمیشہ سے پکا پاکستان رہا ہے۔ اور وہ یہیں کے تعلیمی دروبست کی توڑ پھوڑ کو زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔

خاموشی ہی خاموشی میں پورے ملک کا تعلیمی جائزہ لے لیا گیا۔ اور دونوں بنکوں کے یہودی اس سارے منصوبے کو چلاتے اور ایک خاص شکل دینے والے تھے۔ سروے ٹیمیں بالکل سی، آئی ڈی کی طرح بعض تعلیمی اکابر سے ملیں، اساتذہ سے رائیں لیں، طلبہ سے اُن کے تاثرات جمع کیے۔

اور پھر غور و فکر کے بعد ۶۲ صفحات کی ایک رپورٹ جس کا ظاہری عنوان —— (A DISCUSSION REPORT) ہے۔ دراصل ایک لطیف طرز کا حکم نامہ ہے اور ایسا مقدس حکم نامہ ہے کہ ہمارے ہاں نیت کے لحاظ سے انگوٹھا لگا دیا گیا ہے، البتہ ظاہر میں کچھ ورکنگ نوٹس مرتب کر کے بیوروکریسی اور اربابِ تعلیم کو تھما دیئے گئے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ یہ نوٹس حرفِ آخر ہیں۔ چنانچہ اس کے مطابق تدریجاً عمل شروع ہو گیا ہے۔

آگے چل کر آپ پر کھُلے گا کہ علامہ اقبالؒ، قائدِاعظمؒ اور مولانا مودودیؒ نے خون جلا جلا کر اور جانیں گھُلا گھُلا کر اسلام، پاکستان، نظریۂ پاکستان، اسلامی قومیت تصورِ ملت، احیائے نظامِ اسلامی، ایمانیات و تصورات اور بہ حیثیت قومی زبان

کے اُردو کا جو خزانہ ہمیں دیا تھا، وہ تو زیرِ بحث اسکیم کے پنجے میں ملیامیٹ ہوا جارہا ہے۔

اب تک ہمارے ساہوکارانہ سامراج نے ہمیں کٹھ پتلیاں بنا کر خارجہ پالیسیوں میں مداخلت شروع کی تھی، کچھ مالیات اور ٹیکسوں کے نظام کو بگاڑا، موجودہ بدترین جمہوریت اور حکمران پارٹی کے تحفظ کے لیے سازشوں کے جال بچھائے، موجودہ جمہوریت کو توڑنے کی صورت میں قرضوں اور امدادوں کی بندش کا ٹھینگا دکھایا گیا۔ اب تعلیم کو ہدف بنا لیا گیا ہے۔ دورِ حاضر کے فراعنہ نے تعلیم کے حربے سے مقصد برآری کا راستہ نکالا ہے۔

یہ تو معروف و معلوم حقیقت ہے کہ پاکستانی راہوارِ اقتدار سے صدر ضیا الحق کی نعش اُتارنے کے بعد اس راہوار کی زین پر کس طاقت نے کس کٹھ پتلی کو ہم سب کی دیکھتی آنکھوں کے سامنے بٹھایا۔ پھر مسلسل رکاب تھام کر سہارا دیا۔ عالمی پروپیگنڈے اور ڈپلومیسی کی طاقتوں سے امیج بنایا۔ پھر یہاں امریکی سفارت خانہ علی الاعلان پالیسیوں، احکام اور قوانین کے متعلق رہنمائی دیتا رہا۔ امریکہ سے آنے والے وزرا اور ایلچی اور سینیٹر ہر بار پاکستان کے معاملاتِ خارجہ (خصوصاً بھارت سے تعلقات) کے متعلق رہنمائی بلکہ انتباہات تک دیتے رہے ہیں۔ گویا کہ ہمارے اصل حکمران وہ ہیں۔ ہماری یہ حیثیت نہیں کہ ہمارے لیڈر یا جماعتیں یا اخبارات ان مداخلت کاروں کے تجاوز عن الحدود پر شدید گرفت کریں اور تقاضا کریں کہ ایک آزاد قوم کے ساتھ اپنے طرزِ معاملہ کو درست کریں، ورنہ اپنی تشریفات اور عنایات سے ہماری جان بخشی کریں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا اب نظامِ تعلیم کی رگِ گلو پر چھری رکھ دی گئی ہے۔

کسی قوم کا نظامِ تعلیم اس کے مجموعی نظامِ حیات کا گویا دل و دماغ ہوتا ہے جس کا پہلا کام ایمان و اخلاق اور قوم کے تہذیبی وجود، مخصوص ملّی تشخص، تاریخی زعم غیرہ و بشر،

نظامِ اقدار و شعائر کے سرمائے نئی نسلوں تک پہنچانا، اور اس کے مطابق نصب العین ودلیعت کرنا ہوتا ہے۔ اور نصب العین ہی کی خدمت کے لیے ایک طرف معاشی تگ و تاز انسانی زندگی میں ضروری ہے، دوسری طرف دفاعی قوتوں کی تنظیم اور تیاری کا کام، تیسری طرف علومِ انسانی اور علومِ مادی دونوں میں اس نقطۂ نظر سے ترقی کہ دوسری اقوام سے مسابقت کرتے ہیں پسپائی نہ ہونے پائے اور پہلے سے اگر کوئی کمزوری موجود ہو تو وہ جلد رفع کر لی جائے۔ کیونکہ اب معیشت اور دفاع دونوں کا انحصار علومِ ایمانی، علومِ انسانی اور علومِ مادی کی ہم آہنگ اور متوازی ترقی پر ہے۔

اب ہمارے غلام ساز ساہوکارانہ امریکی سامراج نے یہودیوں کے تعاون سے ایک ایسا قدم اُٹھایا ہے کہ ہماری قومی زندگی کے دل و دماغ کی مرکزی قوت مادی ترقی کے نام سے اغیار کے ہاتھوں میں چلی جائے اور اس کے ایمانی و انسانی پہلو کا خوب اچھی طرح کچومر نکال دیا جائے۔ تاکہ فنڈا منٹلزم کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے، جو سامراجی طاقتوں اور لادین تہذیبوں کے فروغ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اِس وقت (میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ) لادین مادہ پرستی کی نگاہ میں پاکستان وہ سب سے زیادہ خطرناک (SPOT) ہے جہاں سے فنڈا منٹلزم کی وہ طوفانی قوت اُمڈ سکتی ہے جس کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ وہ ممولے کو شہباز سے لڑا دیتی ہے اور ہاتھیوں کو ننھی ننھی چیونٹیاں تڑپا دیتی ہیں۔

وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مغربی الحاد، فسق و فجور، بے حیائی، بدکاری، شراب و قمار، خیانت وغیرہ سب کچھ پھیلے مگر کسی میں اسلام کے لیے اتنا مؤثر جذبہ باقی نہ رہے کہ احتجاج اور ملامت کی کوئی تحریک اُٹھ سکے۔ بلکہ حرام و حلال کی تمیز کے بغیر یہ قوم سب کچھ ہضم کرتی جائے اور پھر نشے میں آ کر کہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں ۔۔ شاہت الوجوہ!!

دنیا میں کوئی ایسی احمق قوم موجود نہیں ہے جو اپنا نظامِ تعلیم دوسروں سے بنواتی ہو۔ مثلاً جیسے جننگ فیکٹری لگانے کے لیے آپ برطانیہ یا جرمنی یا جاپان کو آرڈر دیتے

ہیں اور وہ مطلوبہ نقشے اور معیارِ کارکردگی کی مشینری فراہم کر دیتے ہیں۔ تعلیم اس طرح دوسرے کے ہاں کارخانوں میں نہیں بنوائی جاتی۔ یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو من چہ سرائم و طنبورۂ من چہ سرائد" والی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس رپورٹ (یا حکم نامے) میں مرکزی بات یہ ہے کہ تعلیم کے سامنے اصل مسئلہ "کوالٹی" کا ہے۔ اور کوالٹی کی تشریح خالص مادی معنوں میں یہ کی گئی ہے کہ معاشی و ٹکنیکل ترقی کی صلاحیت کا مطلوبہ معیار تک موجود ہونا۔ ساری تعلیم کا مرکزی نقطہ یہ ہوگا۔ باقی تمام مضامین اور مواد سب بیکار ہے۔ نظریۂ پاکستان، اسلامی تعلیمات، قرآن، حدیث، سیرت، تاریخِ انبیاء، تاریخ اسلام، تاریخِ ملت، اُردو زبان، سب کچھ کوالٹی کی تعریف سے خارج ہے۔ اس قسم کی چیزیں "ہائیر ایجوکیشن" (جس سے رپورٹ اصل بحث کرتی ہے) سے نیچے ہی نیچے رہ جانی چاہئیں۔ یعنی درجہ وسطانی میں میٹرک کے ساتھ ایف اے کی تعلیم کو ملا کر ان لوگوں کو فارغ کر دیا جائے جنھیں چپڑاسی، کلرک، عرضی نویس، امام مسجد، پرائمری ٹیچر، ترکھان، کمہار، خوانچہ فروش، تیلی تنبولی، ٹائپسٹ یا آرٹسٹ بننا ہے۔ رہی اعلیٰ تعلیم جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جائے گی، جہاں سے ملک کے حکمران، لیڈر، دانش ور، سائنس دان، انجینیر، ڈاکٹر، بیوروکریٹس فوجی کمانڈر اور اعلیٰ درجے کے اہلِ تحقیق تیار ہو کر نکلیں گے، ان کے نصاب ہر اُس چیز سے پاک ہوں گے جو "کوالٹی" کے معیارِ برتر کے حصول میں خلل انداز ہوں۔ گویا لفظ "کوالٹی" اپنی مخصوص تشریح کے ساتھ ایک کلیدی اصطلاح ہے اور ساری بحث کو سمجھنے کے لیے اس کو مرکزی نقطے کے طور پر سامنے رکھنا ضروری ہے۔

یعنی ہمارا نظامِ تعلیم خالص معاشی حیوان اور ٹکنیکی روبوٹ پیدا کرنے کا ذریعہ ہوگا۔ اور قدرتی بات ہے کہ جب اعلیٰ تعلیم اس طرح کی ہوگی تو قدرتی طور پر نیچے سے تیاری اسی طرز کی ہوگی تاکہ نیچے سے آنے والا طالب علم ترقی کی راہ پر تیز قدم چل سکے۔

مشہور مثل ہے کہ خانہ، خالی را دیومی گیرد۔ آپ نے اپنے نظامِ زندگی اور

نظامِ حکومت کی طرح نظامِ تعلیم کو بھی مقصد اور نصب العین سے خالی رکھا۔ نتیجہ یہ کہ طالب علم سندوں کے ساتھ ذہنی خلا اور فرسٹریشن لے کے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلتے رہے۔ بار بار پالیسیاں بنیں اور نصابی نقشے بنے، نصابی کتابیں لکھوائی گئیں۔ بعض میں ترامیم و اصلاحات کرائی گئیں، لیکن ماحصل کیا ہے۔ نظریے کا فقدان، مقصد کا خلا اور نصب العین سے محرومی۔

ایسے نظامِ تعلیم سے نکلی ہوئی نسلوں کو آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کس طرح وحدت کے بجائے انتشار کی طرف اور امن کے بجائے خونخواری کی طرف، اور پابندیٔ قانون کے بجائے اپنی قوت کو بنائے قانون بنانے کی طرف اور دینی حدود اور تہذیبی قیود کا احترام کرنے کے بجائے ان کو توڑ کر مخالفانہ اطوار اپنانے کی طرف جا رہے ہیں اور اس رویے پر فخر محسوس کرتے ہیں، وہ اسے ترقی کہتے ہیں، مگر سخت درجے کے ذہنی بحران میں مبتلا ہیں۔ اور اسی وجہ سے حکمرانوں اور منتخب نمائندوں اور لیڈروں اور عہدہ داروں اور دانش وروں میں بھی اخلاقی پستی نمایاں ہے۔ اور ہم بہ حیثیت نظریاتی و تہذیبی گروہ کے ایک ڈوبتے جہاز کی طرح آہستہ آہستہ نیچے جا رہے ہیں۔ اس وقت ہمیں حضرت الیاسؑ جیسے رہنما اور حضرت نوحؑ جیسا سفینہ درکار ہے۔

اتنے بڑے اہم کام اور تعلیم جیسے مہتم بالشان ادارے کے مطالعہ اور اس کی کمزوریوں کو نشان زد کرنے اور اس کے لیے اصلاحات تجویز کرنے کی ذمہ داری کسی پر ڈالتے ہوئے جمہوریت کی نیلم پری کو یہ خیال کیوں نہ آیا کہ پوری قوم کے اس بنیادی مسئلے کو جس کے لیے قرارداد مقاصد میں واضح خطوط بتائے گئے ہیں اور جو ہر قوم کی طرح ہمارے دین اور ہماری تہذیب سے تعلق رکھتا ہے، اسے کوئی بھی قدم اٹھاتے سے پہلے اولاً وفاقی ایوان میں لایا جائے کہ حکومت یہ کام یوں کرنا چاہتی ہے۔ پھر اسمبلی سے نکل کر یہ بحث اخبارات، اداروں اور اساتذہ اور علماء تک پہنچنی چاہیے تھی۔ بعد ازاں ردِ عمل دیکھ کر کوئی فیصلہ کیا جاتا۔

مگر ہمارے ہاں ایک انوکھی جمہوریت گلوٹین بن کر مسلط ہوگئی ہے۔ یہ جمہوریت بس اتنی ہے کہ کوئی پارٹی بطور حکمران منتخب ہوجائے یا کوئی فرد یا (بصورتِ موجودہ) کوئی عورت وزیراعظم بن جائے۔ اس کے بعد وزیراعظم یا اُس کی پارٹی جب جو جی چاہے کرتی رہے، نہ ایوان سے پوچھنے کی ضرورت، نہ رائے عام کے سامنے اشد اہمیت تک کے مسائل لے جانے کی حاجت۔ چاہے کسی سے کوئی لین دین ہوجائے یا کوئی معاہدہ ہوجائے یا قوم کے کسی مسئلے کے حل کی ذمہ داری خود اس کے نظریاتی مخالفین کے سپرد کردی جائے، یا تجارتی یا جنگی یا کسی اور معاملے میں دوست یا دشمن طاقت کے لیے حکومت کی کوئی سی پالیسی نافذ ہوجائے، کسی کو حق نہیں کہ آواز بلند کرے۔ کیونکہ ایک دفعہ جب کسی کو ووٹوں کے بل پر اقتدار مل گیا تو پھر جو چاہے وہ کرے۔ یعنی ایک بار ووٹوں سے جو تخت پر بیٹھ گیا وہ ظل اللہ ہے، چنگیز ہے، ہلاکو ہے، نمرود ہے، شداد ہے، الامان والحفیظ! کیا یہ مارشل لا سے بدتر نہیں؟

آخر ہمارے ساتھ یہ مذاق کیوں روا رکھا جارہا ہے کہ ورلڈ بنک سے خفیہ طور پر سرگوشیوں میں ایک معاملہ طے ہوتا ہے، ذمہ داری سونپی جاتی ہے، رپورٹ بنتی ہے۔ اُسے قبول کرلیا جاتا ہے۔ بس اچانک یہ بات سراپردۂ راز سے باہر نکل آتی ہے کہ اندر کھلیا میں گڑ پھوڑا گیا ہے۔

یہ جمہوریت نہیں ہے۔ یہ آمریت ہے۔ فسطائیت ہے۔ ہٹلرازم ہے۔ جو لوگ اس جمہوریت کا نام آنے پر انگوٹھے چومتے پھرتے ہیں، انھیں اتنا علم نہیں ہوسکا کہ اندر کے مارشل لا سے تو آپ محفوظ ہیں، مگر دشمنوں کی غیر مرئی سامراجیت جمہوریت کے پردۂ رنگین کی آڑ میں آپ کو جو ناکوں چنے چبوا رہی ہے اور صہیونیوں اور بھارتیوں کے منشا کے مطابق آپ کی نظریاتی و دینی تباہی کے جو سامان کر رہی ہے، بلکہ آپ کو معاشی صنعتی دیوالیہ پن کی طرف بھی لے جارہی ہے۔ وہ آپ کو اس لیے پیاری ہے کہ اس نے جمہوریت کے ایک ڈرامے کا انتظام ہمارے لیے کردیا ہے اور ہمارے سیاسی "ڈزنی لینڈ" کے اس ڈرامے کے پیچھے ساری نقشہ گری ان کی ہے۔ یہ مارشل لا

سے دس گنا بدتر صورتِ حالات ہے۔ یہ مارشل لا سے بھی اُوپر کا مارشل لا ہے۔ اور یہاں سیاسی مؤذن، صحافتی بانگیئے اور دانش ور منادیئے چاروں طرف پکارتے پھرتے ہیں کہ جمہوریت اگر ملک کی ساری دولت کو دریا بُرد کر دے، اگر اقتصادیات کو تباہ کر دے، اگر اخلاق و شائستگی کو غارت کر دے، اگر قدم قدم پر لہو کی ندیاں بہانے کے سامان کر دے۔ اگر وہ رعایا کے زن و بچہ کو کولہو میں پیل دے، اگر وہ خارجہ پالیسی کی مارکیٹ میں پاکستان کی قدر و قیمت گرا کر اسے ذلیل کر دے بلکہ اگر وہ بین الاقوامی دارالرقیق (غلام فروشی کی منڈی) میں ساری قوم کو بیچ دے تب بھی اس کی جُوتیوں کو چومنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ بعض مسلمانوں نے اپنے دین کے متعلق ایسی والہیت کبھی نہیں دکھائی، وہ موجودہ مکروہ جمہوریت کو تو گویا پُوجنے کے لیے تیار ہیں۔ کیا خدا اور رسولؐ کے لیے بھی ایسی فریفتگی کا کوئی مظاہرہ آپ کر سکے۔

۲۔ جائزۂ تعلیم اور نقشۂ اصلاح کا کام اگر کرنا ہی تھا تو کیا اس ملک میں دس بیس افراد ایسے نہ تھے جو علم و تجربہ کی قوتوں سے کام لے کر اس خدمت کو انجام دیتے اور اس معاوضہ (زرِ مبادلہ) کی رقم کو بچایا جا سکتا تھا کہ بیرونی بنکوں کے وفودِ ماہرین کو ادا کی گئی۔ اور ملک کو اس خطرے سے بچایا جا سکتا تھا کہ صلیبی اور صہیونی طاقتیں ہمارے معاشرے کی گہرائیوں میں اُتر کر نہ صرف رپورٹ مرتب کریں بلکہ ساتھ ہی جاسوسی کا فریضہ از خود انجام پا گیا۔

گویا ہم نے دنیا کے سامنے ایک تو یہ اعلان کیا کہ ہمارے پاس محض دس بیس ماہرینِ تعلیم بھی ایسے نہیں ہیں کہ جن کی مدد سے ہم تعلیمی خرابیٔ احوال کا جائزہ لے سکیں اور اصلاح و ترقی کی اسکیم بنا سکیں۔

دوسرے یہ کہ ہم نے دُنیا کو اپنی یہ کمزوری بھی دکھا دی کہ ہمارے ملک اور شعبوں اور اداروں کے ماہر مشیر (بلکہ کارپرداز) غیر پاکستانی، سامراجی عناصر ہیں۔

۳۔ ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا تعلیم ایسا لباس ہے کہ جو ایک ہی ساخت کا ہوتے ہوئے ہر قوم کو فِٹ آ سکے۔ بلالحاظ اس کے کہ اس کا قد و قامت کیا ہے؟

اس کی اُمنگیں کیا ہیں ؟ اس کا نظریۂ تعلیم ، درمقصدِ تعلیم کیا؟ کون سے اجزا اور عناصر ہیں جن کا تعلیم سے خارج ہوجانا یا کمزور ہوجانا کسی قوم کے لیے تباہ کن ہوسکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میرے لیے قرآن کا مفہوم سمجھانے کو ورلڈ بنک یا بین الاقوامی ترقیاتی بنک آکے درس دے؟ کیا یہ قرینِ قیاس ہے کہ تحریکِ پاکستان کی رُوح اور اس کے مقصد اور اس کی مزاحم قوتوں کے متعلق انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ کی ٹیم آکر مجھے بتائے کہ اس دائرے میں مجھے کیا کرنا چاہیے یا کیا نہیں ؟

آزادی سے پہلے بھی ہماری تقدیر باہر سے بن کر آتی تھی، اب بھی اگر ہماری تقدیر باہر ہی سے طے ہو کر آئے تو آخر فرق کیا ہوا۔ پہلے دَورِ غلامی کے خلاف تو سیاسی تحریکیں تھیں، ایجی ٹیشن تھا، سول نافرمانی تھی۔ پورا ادب چیخ رہا تھا، مذہبی اداروں سے صدائے اختلاف و احتجاج، بلکہ تکفیر جہاد تک بلند ہو رہی تھی۔ لیکن موجودہ آسیبی غلامی کو اوّل تو غلامی سمجھنا مشکل، پھر جس غلامی کو جمہوری حکومت کمالِ آزادی سمجھتی ہو، اس کے خلاف تحریکیں کیا اُٹھیں۔ ہم ان نئی زنجیروں کو توڑنا چاہتے ہیں۔ مگر ہمارے اکابر یہ زنجیریں ہمیں پہناتے ہوئے خوش ہیں۔ گویا جمہوریت کا اصرار ہے کہ غلامی کرلو۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ ہم غلامی پر لعنت بھیجیں ——— خواہ وہ اندر کی فسطائیت کی ہو، یا بیرونی سامراجیت کی۔

۴۔ معلوم ہوا ہے کہ اس رپورٹ پر شرط پوری کرنے کے لیے چند سیمینار بھی کرائے گئے ہیں جو خفیہ نوعیت کے تھے۔ یعنی اپنے خاص خاص آدمیوں کو کسی ہال میں جمع کرکے باتیں کرالی گئیں۔ فری میسنوں کی طرح نہ کوئی اخباری اعلان، نہ تفصیلی رپورٹ۔ سوال یہ ہے کہ اس اخفا کی ضرورت کیا تھی اور جمہوریت کے پردے کے پیچھے بیٹھ کر خفیہ سرگوشیاں کرنا کیا جمہوریت کا نقیض نہیں ہے۔ ایک پبلک مسئلہ تھا۔ آپ اُسے پبلک میں لاتے، تمام سیاسی جماعتوں اور دینی اداروں اور علمی مراکز کو بھیجتے اخبارات کو پہنچاتے، بڑے شہروں میں اعلان کردہ سیمینار خود بھی منعقد کرتے، اور دوسروں کو بھی اس کا موقع دیتے۔ بیانات اور قراردادیں شائع ہوتیں، اساتذہ سے

پوچھا جاتا، پھر آپ اُسے وفاقی ایوان کے سامنے مشورے کے لیے رکھتے، اس کے بعد فضا کا مجموعی رنگ دیکھ کر آپ فیصلہ کرتے کہ یہ قدم اُٹھانا چاہیے یا نہیں۔

آخر یہ کون سی جمہوریت ہے کہ اخفا کا ایک جزیرہ آپ نے الگ بنا لیا ہے، اس جزیرے سے باہر کسی کو خبر ہی نہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے، اور اندر وہ فیصلے ہو رہے ہیں کہ قوم کی پوری زندگی تلپٹ ہو جائے اور اس کے اہم ترین اداروں کا نقشہ بدل جائے۔

ہم اس نظامِ اخفا کو مُلک کے لیے نہایت خطرناک، نہایت مہلک اور نہایت تباہ کُن سمجھتے ہیں۔ اور اس کی خطرناکی میں اس بات سے اور اضافہ ہو جاتا ہے کہ یہ جمہوریت کے نام سے ہو۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ اس اِخفائی ٹیکنیک کو اور بھی کئی اہم اُمور میں بہت ہی تباہ کن انداز سے استعمال کیا گیا ہے۔

۵- آخر میں اس رپورٹ کے ''سگنلز'' کو قبول کرتے ہوئے جو ڈائرکیٹو جاری کیا گیا ہے اور جس کے تحت درس گاہوں کی ایک خاص تعداد میں اوّلین مرحلے میں آزاد کردینے کا فیصلہ کیا گیا ہے، اسے کیوں وفاقی ایوان میں باقاعدہ منظوری کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔ اور ایسی جلدی بھی کیا تھی کہ سارا اقدام ایک طرح کے آرڈی نینسی سسٹم پر ہو جائے اور کوئی سوال، اعتراض یا اختلاف رُونما نہ ہو۔ کیا واشنگٹن سے آنے والی ہدایات (چاہے رپورٹوں کی شکل میں ہوں) وحی و الہام ہیں کہ اُن کے لیے اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا کہنے کے علاوہ کوئی اور رویہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔

واضح رہے کہ دس سال میں حکومت تمام تعلیمی اداروں کو گھر سے نکال باہر کرے گی کہ میاں جاؤ، اپنے لیے خود کماؤ اور کھاؤ۔ اماں باوا کی روٹیاں کہاں تک توڑو گے۔ پہلی اطلاع یہ تھی کہ صرف پنجاب میں پہلے مرحلے میں ۹ اعلیٰ ترین مراکزِ تعلیم اور ۱۳ معیاری اسکولز کو حکومت گود سے نکال کر باہر پھینک دے گی۔ دلچسپ بات یہ کہ حسبِ رسم ایک نمائشی تردیدی بیان بھی پنجاب میں نکلا۔ مگر اب تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ محکمہ تعلیم پنجاب کے سیکرٹری مسٹر طارق سلطان صاحب نے ان اطلاعات

کی تردید کی (وہی مغالطہ انگیز تردید) کہ تعلیمی اداروں کو نجی شعبوں کے حوالے کیا جارہا ہے۔
"تاہم" انہوں نے بتایا کہ ۱۲ اہم کالجوں اور ۱۲ اسکولوں کو خود مختاری دی جائے گی۔
(اسی پہ بس نہیں) فرمایا: اس منصوبے پر مرحلہ وار عمل کیا جائے گا۔ اور اس میں کم از کم
ایک ڈویژن سے ایک ایک سکول اور کالج کو شامل کیا جائے گا۔ اب فارغ خطی مل رہی
ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کو، کینرڈ کالج لاہور کو، کالج فار ویمن لاہور، گورنمنٹ کالج
راولپنڈی کو، گورنمنٹ زمیندارہ کالج گجرات کو، گورنمنٹ کالج سرگودھا کو، گورنمنٹ
کالج برائے خواتین فیصل آباد کو، گورنمنٹ کالج ساہیوال کو، گورنمنٹ کالج ڈیرہ
غازی خاں کو، گورنمنٹ ایف سی کالج بہاول پور کو، گورنمنٹ کالج فار بوائز فیصل آباد کو،
اور مرے کالج سیالکوٹ کو۔ پھر اسکولوں کی لسٹ ہے۔ تو جناب اور کرائیے تردید۔
کاش کہ پنجاب ہی اختلافی یا اجتماعی آواز اٹھا سکتا ــــ وزارات، اخبارات،
تعلیمی اکابر ــ مگر جنید و شبلی و عطار ہم مست! ــ کوئی آدمی بالائی حلقوں میں
ایسا نہیں جو جرأت سے اس آسیبی غلامی کے خلاف قوم کو چونکا سکے۔
افسوس کہ اس ملک میں آج جرأت مند، دیانت دار اور دانش ور لیڈر کسی دائرے
میں نہیں۔ کیا دلچسپ کھیل ہے کہ قوم الگ، اسمبلی الگ، وزیر اعظم الگ! وزیر اعظم
پوری قوم اور نسلوں کو متاثر کرنے والے فیصلے اور اقدام کر ڈالے اور نہ اسمبلی کو خبر ہو،
نہ قوم کے کانوں میں بھنک پڑے۔ سبحٰن اللہ! کیا ہی پُر اسرار جمہوریت ہے۔ یوں سمجھیے
کہ جمہوریت کی یخنی تیار کی جارہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ ذرا زہریلی ہے۔[1]

(باقی)

---

[1] یہ مضمون ایک ماہ پہلے لکھا گیا تھا۔

تخت اُلٹ گیا

رسالہ تکمیلی مرحلے میں ہے کہ یہ زلزلہ انگیز خبر آئی کہ قومی اسمبلی توڑ دی گئی ہے اور بیس ۲۰ ماہ تک ایک دینی ہدایت کی پامالی جس طرح نسوانی حکومت کے وجود سے ہوئی، وہ بلا بھی ٹلی، اور جو عذاب معاشرے کے مختلف دائروں میں سر اٹھا رہا تھا اس سے نجات پانے کے امکانات بھی پیدا ہوئے۔ معاشرے میں ایسے کسی واقعے کا انتظار تھا۔ دعا کرنی چاہیے کہ خدا اصلاح و برکت کا سامان کرے۔

قرآن نے عزت و اقتدار کے متعلق قدرت کے جو قوانین اور ماضی کے تاریخی نظائر ہمارے سامنے رکھے ہیں، نیز علومِ عقلیہ نے بھی ان میں سے بیشتر کی تائید کرتے ہوئے جو کچھ بتایا ہے وہ یہی ہے کہ جب کسی حکومت کے نظام میں خدمتِ عوام کا اصل مقصد دب جاتا ہے۔ ظلم اور خیانت اور تشدد کا زور ہو جاتا ہے تو ایسی کوئی بھی حکومت چل نہیں سکتی۔ قرآن نے ایک بڑا اصول تو یہی بتایا کہ فَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (سورۂ رعد-۱۷) یعنی جو کوئی فرد یا ادارہ یا نظام یا حکومت انسانوں کی بھلائی کا سامان کرے، اُسے زمین میں ٹھیراؤ نصیب ہوتا ہے۔ آپ اگر ظلم اور خون خرابے اور لوٹ مار کے حالات کو جمہوریت کا چغہ پہنا دیں تو اس سے ظلم اور جرم کی تقدیر نہیں بدل جاتی۔ اس کے بالمقابل بسا اوقات بظاہر مغربی تصور کے لحاظ سے غیر جمہوری حکمران عبادت، عدل، احسان، فروغ حیا، توسیع علم اور بلند ترین مسند پر بیٹھ کر انکسار اور محبتِ عوام کی ایسی مثالیں قائم کرتے ہیں کہ اُن کو نسبتاً زیادہ مہلتِ کار ملتی ہے۔

اب اس تبدیلی کے پیچھے صدر صاحب کے عزائم کتنے ہی اچھے ہوں، لیکن عبوری حکومتوں کو چلانے کے لیے کوئی اونچے اسلامی اصول یا درخشاں کردار رکھنے والے لوگ تو سامنے نہیں ہیں۔ لہٰذا کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ صدر صاحب نے اپنی تقریر میں سابق حکومت اور افرادِ حکومت کے متعلق جو سیاہ ریکارڈ بیان کیا ہے، اگر اس کا احتساب نہیں ہوتا تو قوم کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچے گا۔ جتوئی صاحب (عبوری وزیر اعظم) نے احتساب پر زور دیا ہے۔ دوسری بڑی چیز ہمارے سامنے یہ ہے کہ "لکھ لُٹ" بن کر سرکاری خزانے اور بنکوں پر جو ہاتھ مارے گئے تھے ان سب کا نوٹس لیا جا رہا ہے اور ناجائز اور نا اہل لوگوں کو سیاسی بنیادوں

پر بھرتی کرنے کی جو افسوسناک حرکت کی گئی تھی، اس کی تلافی کی جا رہی ہے۔ اسی طرح کراچی اور سندھ کے خون خرابے کے طوفان کو روکنے کے لیے سابق حکومت کی متعین کردہ فوج کو دفعہ ۲۴۵ کے اختیارات دے کر عوام میں نئی امید پیدا کر دی گئی ہے۔

اس کے ساتھ اگر ممکن ہو تو یہ کام بھی ہونا چاہیے کہ جناب صلاح الدین ایڈیٹر تکبیر، جناب الطاف حسین قریشی اور جناب مجیب الرحمٰن شامی نے ماہر قانون خالد اسحٰق کے تعاون سے دستوری تقاضوں کے مطابق جن اصلاحات کا فیصلہ عدلیہ سے لیا تھا، سابق حکومت نے اسے اپنے لیے غیر مفید پا کر اپیل کر رکھی تھی۔ اگر اس اپیل کو واپس لے کر انہی انتخابی اصلاحات کے تحت اگلے انتخابات کرائے جائیں تو بہت اچھے نتائج نکلنے کی توقع ہے۔ خصوصاً برطرف شدہ حکومت نے صوبائی نشستوں کے لیے ۳ ہزار روپے اور قومی نشستوں کے لیے ۵ ہزار روپے خرچ کرنے کی جو اجازت امیدواروں کو دی تھی، اُسے کالعدم قرار دے دیا جائے۔ یہ موقع اس تجربے کے لیے موزوں ہے کہ پیش آمدہ انتخابات متناسب نمائندگی کے اُصول کے تحت ہوں۔

آخری ضروری بات یہ کہ اسلام جو پاکستان کو جوڑنے کا اور قوم میں قوتِ ایمان و عمل اور اعلیٰ معیارِ اخلاق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، اس کی حقیقی خدمت کی راہیں نکالی جائیں۔ اول تو ضیاء الحق شہید کے دور میں جو جو اقدام ہوئے ان کو مستحکم اور مؤثر بنایا جائے، خصوصیت سے ٹی وی کو اسلام اور اسلامی اخلاق و ثقافت کی پامالی سے روکا جائے، شریعت بل کے معاملے پر توجہ دی جائے، مگر شریعت کا نام سُن کر حدود و تعزیرات کے دائرے میں محدود ہو کر سوچنے والے حضرات سے گزارش ہے کہ وہ اسلام کے تقاضے، تعلیم، معاش، ثقافت اور تہذیب کے دائرے میں بھی پورے کریں۔

بہت ہی اہم تقاضائے فرض یہ ہے کہ سانحہ بہاولپور میں صدر ضیاء الحق شہید کے ساتھ سازش کا شکار ہونے والے ۳۰ افسروں کے بارے میں تحقیقات از سرِ نو شروع کرنے کا اعلان کیا جائے۔

ایک خاص ضروری بات یہ کہ عبوری دورِ حکومت کو ہر قسم کی جانبداری سے بچنا چاہیے، کیونکہ یہ بھی ظلم ہی کی ایک قسم ہے۔

ہماری رائے میں یہ وہ اقدامات ہیں جو حالیہ تبدیلی سے اچھے نتائج حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ (نعیم صدیقی)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

۱۴ راگست کا پیغام

(ادارہ)

"پاکستان کے قیام کے وقت ۱۹۴۷ء میں ۱۴ راگست کی تاریخ ایسی حالت میں آئی تھی کہ اس ملک کے تمام مسلمان ایک اُمّت تھے۔ اُن کے درمیان کسی قسم کے علاقائی، نسلی، لسانی اور نظریاتی تفرقے موجود نہ تھے۔ کسی کے اندر بنگالی، پنجابی، پٹھان، سندھی یا بلوچی ہونے کا احساس موجود نہ تھا، بلکہ صرف مسلمان ہونے کا احساس تھا۔ سب اس بات پر متفق تھے کہ اس سرزمین کو اسلام کا گھر بنانا ہے۔ اور کسی دوسرے نظریے کو یہاں رواج دینے کا تصوّر تک نہ کیا جا سکتا تھا۔ اِسی اتفاق و اتحاد کی بدولت پاکستان وجود میں آیا اور ہم نے ۱۹۴۷ء میں آج کے دن وہ وقت دیکھا، جسے دیکھنے کے لیے ایک مدّت دراز سے برّصغیر ہندوستان و پاکستان کے مسلمان ترس رہے تھے۔ لیکن آج ۲۴ سال کے بعد ہی ۱۴ راگست کی تاریخ ایسی حالت میں آئی ہے کہ علاقائی، لسانی اور نسلی منافرتوں نے اُبھر کر ہمارے مسلمان ہونے کے احساس کو اتنا دبا دیا کہ مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ رہی۔ کافروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں نے مسلمانوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جو تقسیم کے وقت اور اس سے قبل کے ہنگاموں میں غیر مسلموں نے بھی نہ کیا تھا۔ آپس کی منافرت سے ہم نے خود اُس پاکستان کے وجود ہی کو خطرے میں ڈال دیا جو لاکھوں مسلمانوں کی قربانیوں سے بنا تھا اور ہمارے اندر بڑے بڑے گروہ ایسے اُٹھ کھڑے ہوئے جو اسلام کے مقابلے میں باہر سے

درآمد کیے ہوئے نظریات کو یہاں فروغ دینا چاہتے ہیں۔ یہ ایسا کفرانِ نعمت ہے جس کی سزا ہم اِس وقت بھگت رہے ہیں اور اگر ہم اس سے باز نہ آئے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی مزید اور کیا سزا ہمیں ملے گی۔ اس لیے درحقیقت ۱۴ اگست کا دن اِس سال کوئی جشن منانے کا دن نہیں ہے، بلکہ توبہ اور استغفار کا دن ہے۔ اللہ سے یہ دُعا مانگنے کا دن ہے کہ وہ ہماری ان غلطیوں کی اصلاح فرما دے جن کی بدولت ہم اس وقت اندرونی و بیرونی خطرات میں گھِر گئے ہیں۔ اور اللہ سے یہ عہد کرنے کا دن ہے کہ ہم اپنی تمام قوتیں علاقائی اور لِسانی اور نسلی منافرتوں کو ختم کرنے میں صرف کردیں گے اور اسلام کے مقابلے میں دوسرے نظریات کو فروغ دینے کی کسی کوشش کو یہاں نہ چلنے دیں گے۔ پاکستان کے مسلمان اگر سچے دل سے یہ عہد کریں اور اس کو پُورا کرنے کے لیے اپنی حدِ امکان تک جدوجہد کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کریں تو اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان نقصانات کی تلافی بھی کردے گا جو اَب تک ہماری غلط روش کی وجہ سے ہوچکے ہیں۔ اور آئندہ کسی شدید تر عذاب سے بھی ہمیں بچا لے گا۔"

(آئین، لاہور مورخہ ۸ اگست ۱۹۷۱ء)

اسلامی نظامِ معاشرت کا ایک بہت اہم پہلو

جناب حکیم شریف احسن صاحب

(۲)

حُسنِ جوار چونکہ معاشرہ میں اخوت و محبت کی فضا پیدا کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اس لیے حضورؐ نے اس کی تائید کے لیے نئے نئے اسلوب اختیار فرمائے۔ پہلے گذر چکا ہے کہ آپ نے موذی ہمسایہ کے ایمان کی نفی کی۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے اس قبیح فعل کے بُرے نتیجہ کو یوں بیان فرمایا ہے کہ" وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے پڑوسی اس کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہ ہوں"[۱] یہ سزا موذی ہمسایہ کے مناسب حال ہے جو شخص اللہ کے بندوں میں سے بھی خاص کر اپنے پڑوسیوں کو اذیت پہنچاتا ہے اللہ اُسے ابدی راحت کے مقامِ جنت میں کیوں داخل کرے! اس سے معلوم ہوا کہ ایذائے ہمسایہ ایسا مذموم فعل ہے جو نیکیوں کو جلا کر رکھ دیتا ہے۔ اس کا مؤثر اور دل نشین بیان عہدِ رسالت کے اور واقعہ میں ملتا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عورت کے بارے میں عرض کیا کہ اس کے کثرت کے ساتھ نماز پڑھنے، روزے رکھنے اور خیرات دینے کا بہت چرچا ہے، لیکن اپنی زبان سے وہ اپنے پڑوسیوں کو تکلیف دیتی ہے۔ فرمایا: اس میں کوئی بھلائی نہیں، وہ دوزخ میں جائے گی"۔ اس شخص نے ایک اور عورت کے متعلق بتایا کہ اس کا ذکر

---

[۱] مسلم الصحیح ۱/۵۰

کم نماز پڑھنے، کم روزے رکھنے اور کم خیرات کرنے سے لیا جاتا ہے۔ اور وہ پنیر کے ٹکڑے صدقہ میں دیتی ہے۔ البتہ وہ اپنی زبان سے اپنے ہمسایوں کو ایذا نہیں پہنچاتی۔ فرمایا: "وہ جنت میں جائے گی"[1]

اس حدیث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں انسانوں کے ساتھ انسانوں کے رویہ کو کتنی اہمیت ہے اور ہمسایہ کو ایذا رسانی اور وہ بھی محض زبانی، اگر ڈھیروں عبادات کو راکھ میں تبدیل کر سکتی ہے تو عملاً ایذا دینے کی سزا کتنی سنگین ہو گی! یہ حدیث معارف کا ایک گنجینہ ہے۔ لیکن یہاں اس پر مفصل گفتگو کی گنجائش نہیں۔ بس اتنا یاد رکھیے کہ حقوق العباد کے سلسلے میں یہ قولِ فیصل ہے۔ اس حدیث کی رو سے حقوق العباد کی ادائیگی یا عدم ادائیگی پر کسی کے جنت یا جہنم میں جانے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ حقوق العباد کی یہ اہمیت اس وجہ سے ہے کہ وہ صرف حقوق العباد نہیں، حقوق اللہ بھی ہیں۔ کیوں کہ ان کے ادا کرنے کا حکم اللہ ہی نے دیا ہے۔ اس طرح بندوں کا ایسا کوئی حق نہیں جو اللہ کا حق بھی نہ ہو، لہٰذا ان کی اہمیت زیادہ ہے۔ یہ حدیث حضورؐ کے اس ارشاد کو بھی سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ خیر الجیران عند اللہ خیرھم لجارہ[2] یعنی اللہ کے نزدیک سب سے اچھا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسیوں کے لیے سب سے اچھا ہو۔ یہ اس لیے کہ وہ بندوں کے اس حق کی ادائیگی میں ــــ جو اللہ کا حق بھی ہے ــــ سب پہ سبقت لے گیا۔

اوپر بعض زبانی ایذا کا ذکر ہوا ہے۔ اب دیکھیں عملاً اذیت رسانی کا گناہ کس درجہ سنگین ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک روز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے زنا کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے عرض کیا "حرام ہے، اللہ

---

1. احمد بن حنبل، مسند۔ المکتبۃ الاسلامیہ بیروت، ۱۳۸۹ھ۔ بخاری، الادب المفرد واثریہ سانگلہ ص ۴۲۔
2. ترمذی، سنن۔ مجتبائی دہلی ۱۳۴۲ھ، ۱۶/۲۔ بخاری الادب المفرد ص ۴۰۔

اور اس کے رسول نے اسے حرام کیا ہے۔" فرمایا: "پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا دس عورتوں کے ساتھ زنا کرنے سے بدتر ہے۔" پھر آپ نے چوری کے متعلق دریافت فرمایا۔ صحابہؓ نے جواب دیا: "حرام ہے، اللہ اور اُس کے رسول نے اسے حرام کیا ہے۔" فرمایا: دس گھروں میں چوری کرنے سے سنگین تر جرم پڑوسی کے گھر میں چوری کرنا ہے[1]۔" ایک اور موقع پر ایک سوال کے جواب میں آپؐ نے پڑوسی کی بیوی کے ساتھ بدکاری کو خدا کے ساتھ شرک اور قتلِ اولاد کے بعد سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے[2]۔

لسانِ نبوت پر ان جرائم کا اس درجہ سنگین قرار پانا عقلی تقاضوں کے بالکل مطابق ہے۔ پڑوسی پر حق ہے کہ وہ اپنے ہمسایہ کی عزت و آبرو اور مال و دولت کی حفاظت کرے۔ اس نے انہیں پامال کیا۔ اس لیے اس کے جرم کی شناعت دس گنا سے زیادہ ہو گئی۔

ایذائے جار کے بارے میں اسلام نے اپنے مزاج کے مطابق تعزیری اقدامات کرنے کے بجائے لوگوں کے ایمان، اخلاق اور ضمیر سے اپیل کی ہے اور انہیں اس کے ہولناک اُخروی نتائج سے خبردار کیا ہے، لیکن یہ بھی نہیں کہ یہاں اس کی کھلی چھٹی ہے۔ حضورؐ کے سامنے ایک شخص نے اپنے ایذا رساں ہمسائے کی شکایت کی۔ آپؐ نے اُسے صبر کی تلقین فرمائی۔ دوسری یا تیسری مرتبہ جب وہ یہی شکایت لے کر آیا تو آپؐ نے فرمایا: اپنا سامان گھر سے نکال کر رستے میں ڈال دو۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ آنے جانے والوں نے متعجب ہو کر اس کا سبب پوچھا تو اُس نے ساری کہانی سنا دی۔ جس نے بھی اسے سنا اس ہمسایہ کو لعنت ملامت کا ہدف بنایا۔ اُسے بھی یہ خبر پہنچ گئی۔ ندامت کے ساتھ آ کر اپنے پڑوسی سے گھر چلنے کی درخواست کی اور خدا کی قسم کھا کر یقین دلایا کہ وہ آئندہ ایذا نہیں دے گا[3]۔

۱؎ بخاری، الادب المفرد ص ۴۰۔

۲؎ بخاری، الصحیح ۲/۶۷، ۱۱۴؛ مسلم ۱/۶۳

۳؎ ابوداؤد، سنن، اصح المطابع کراچی ۱۳۶۹ھ ص ۷۰۱۔ بخاری، الادب المفرد ص ۴۲۔

کوئی جسمانی سزا اس قدر مؤثر نہ ہوتی جتنی یہ نفسیاتی تدبیر کارگر اور عبرت ناک ثابت ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ بُرا پڑوسی سر پر لٹکتی ہوئی تلوار کی طرح ایک مستقل عذاب ہے، جس سے انسان کی جان، مال اور آبرو ہر وقت خطرہ میں رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے خود بھی بُرے پڑوسی سے اللہ کی پناہ مانگی: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ جَارِ السُّوْءِ[1] (اے اللہ! میں بُرے پڑوسی سے تیری پناہ مانگتا ہوں) اور اُمت کو بھی اسی کی تلقین فرمائی کہ (تعوذوا باللّٰہ مِنْ جارِ السوء[2]) بُرے ہمسایہ سے اللہ کی پناہ مانگو۔

اس کے برعکس اچھا ہمسایہ اللہ کی رحمت کا سایہ ہوتا ہے، جو آڑے وقت میں کام آنے کے لیے ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ یا پھر اس کی مثال اس میٹھے چشمے کی ہے، جو انسان کے گھر کے سامنے بہ رہا ہو۔ اور اُسے شاد کام کرنے کے لیے ہر وقت اس کے دروازے پر موجود ہو۔ اسی بنا پر حضورؐ نے بھی اسے انسان کی خوش بختی قرار دیا اور فرمایا: "وسیع گھر، نیک ہمسایہ اور خوشگوار سواری مردِ مسلمان کی خوش بختی کی علامات ہیں[3]۔"

انسان کو یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اُسے اچھا کہیں، لیکن دراصل اچھا انسان وہ ہوتا ہے جو اپنے سے قریب ترین لوگوں کی رائے میں اچھا ہو۔ اس چیز کو حضورؐ نے نہایت حکیمانہ انداز میں پڑوسیوں کے حُسنِ سلوک کی ترغیب کا ذریعہ بنایا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے عرض کیا: "یا رسول اللہ! مجھے کیسے معلوم ہو کہ میں اچھا کر رہا ہوں یا بُرا؟" فرمایا: "جب تم پڑوسیوں کو یہ کہتے سُنو کہ تم نے اچھا کیا ہے تو سمجھ لو کہ تم نے اچھا کیا ہے۔ اور جب تم انہیں یہ کہتے سنو کہ تم نے بُرا کیا ہے تو جان لو کہ تم نے

---

[1] بخاری الادب المفرد ص ۴۰

[2] نسائی، سنن، قدیمی کراچی ت۔ن ۲/ ۳۱۸

[3] بخاری الادب المفرد ص ۴۰

بُرا کیا ہے[1]۔ پڑوسیوں کی رائے کو یہ وزن اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے نیک و بد سے سب سے زیادہ واقف بھی ہوتے ہیں اور اچھے یا بُرے رویّہ کا اوّلین ہدف بھی۔ جو ہمسایوں سے اچھا سلوک نہیں کرے گا، اُسے وہ کیوں اچھا کہیں گے، اور دُور والے اس سے اچھائی کی کیا توقع رکھیں گے۔ گویا پڑوسیوں سے اچھا یا بُرا رویّہ اختیار کرنا دوسرے لفظوں میں اپنی نیکیوں یا بدنامی کا اشتہار دینا ہے۔

پڑوسیوں کے بارے میں حسنِ سلوک کے جو تاکیدی اور بکثرت احکام حضورؐ نے دیئے ہیں، ان کی روشنی میں انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ اُسے کس موقع پر کیا رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس کے باوجود بعض خاص اُمور میں ان کے قابلِ نزاع یا زیادہ اہم ہونے کی وجہ سے آپؐ نے خاص ہدایات صادر فرمائیں۔ ان میں سے ایک معاملہ گھر یا جائیداد کی خرید و فروخت کا ہے۔ بعض اوقات کوئی شخص اپنا مکان کسی اور کے ہاتھ بیچ دیتا ہے، حالانکہ ہمسایہ اس کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ اس سے آنے اور جانے والے ہمسایوں اور اس کے تعلقات میں ایک ایسی تلخی جنم لیتی ہے جو رستے ہوئے ناسور کی طرح ہمیشہ باعثِ آزار رہتی ہے۔ اور یہ چیز خدا و رسول کے حکمِ احسان کی بالکل ضد ہے۔ اس لیے حضورؐ نے ارشاد فرمایا: الجار اَولی بصقبہ[2]۔ یعنی پڑوسی قرب کی وجہ سے زیادہ حقدار ہے۔ اس سے بعض اوقات ایثار بھی کرنا پڑتا ہے، لیکن اہلِ ایمان ایسا کرتے ہیں۔ تاریخ اس واقعہ کی شاہد ہے کہ حضرت ابو رافعؓ کے دو مکان حضرت سعدؓ بن وقاص کی حویلی میں تھے۔ ان کے پانچ سو دینار نقد نہیں مل رہے تھے، لیکن حضرت سعدؓ چار سو سے زیادہ ـــــ اور وہ بھی بالاقساط ـــــ دینے پر تیار نہ تھے۔ حضرت ابو رافعؓ نے ان چار سو بالاقساط کو پانچ سو نقد پر ترجیح دی، یہ کہتے ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الجار اولی بصقبہ[3]

(باقی)

---

[1] احمد، مسند ۱/۴۰۲

[2] بخاری در فتح الباری ابن حجر۔ اسلامیہ لاہور ۱۴۰۱ھ ۱۲/۳۴۵

[3] ایضاً

اسلامی شریعت میں پیشۂ وکالت کی حیثیت

تحریر۔ خادم حسین الٰہی بخش

ترجمہ: عصمت اللہ - رفقاء ادارہ معارف اسلامی منصورہ

وکالت عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں سپرد کرنا، تفویض کرنا، حفاظت و نگرانی کرنا اور اعتماد کرنا ہیں۔ قرآن مجید میں ہے "وَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا" یعنی ہم نے اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دیئے ہیں۔ فقہی (قانونی) اصطلاح میں اس کا مفہوم اپنی سہولت اور آزمائش کی خاطر یا عجز و معذوری کی بنا پر شرعاً جائز اور معلوم تصرف میں کسی کو اپنا قائم مقام بنانا ہے[1]۔ بعض فقہا نے اس کی تعریف یوں کی ہے ۔ "تصرف کا شرعی حق رکھنے والے شخص کا کسی کو قابلِ نیابت امور میں اختیارات تفویض کرنا، جنہیں وہ مؤکل کی طرف سے زندگی میں استعمال کر سکتا ہو"[2]۔

وکالت کا جواز قرآن وحدیث اور اجماع سے ثابت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ .....

(یعنی صدقات تو دراصل فقیروں، مسکینوں اور عاملینِ صدقات کے لیے ہیں"۔

---

[1] ردالمختار علی الدر المختار۔ محمد بن عابدین ۴/۵۵۴ - اور اللباب نے شرح الکتاب۔ عبدالغنی الغنیمی ۲/۱۳۸ -

[2] مغنی المحتاج الی معرفتہ معانی المنہاج -

اور عاملینِ زکوٰۃ دراصل مستحقین کی طرف سے نائب کے طور پر صاحبِ نصاب لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عروہ بن بارقی کو ایک بکری کی خریداری، عمرو بن امیہ الضمری کو ام حبیبہؓ کے نکاح اور ابورافع رضی اللہ عنہ کو ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح میں اپنا وکیل مقرر کیا تھا۔

اُمت کا اس بات پر اجماع ہے کہ ضرورت کی بنا پر وکالت فی الجملہ جائز ہے۔ اس لیے کہ ہر آدمی اپنے سارے ضروری کاموں کو از خود سر انجام دینے کی صلاحیت یا فرصت نہیں رکھتا۔ وکالت میں تصور میں چار چیزیں بنیاد کے طور پر شامل ہیں۔ ان کے بغیر وکالت مکمل نہیں ہو سکتی۔

۱۔ مؤکل ۲۔ وکیل ۳۔ مؤکل فیہ یعنی جس کام یا غرض میں وکیل کو اختیارات دیے گئے ہیں۔ ۴۔ صیغہ یعنی وکالت نامہ کے لیے قانونی الفاظ۔

موکل اور وکیل دونوں کا عاقل ہونا ضروری ہے۔ موکل کے لیے ضروری ہے کہ جس کام میں وہ وکیل بنا رہا ہے وہ اُسے خود کرنے کا اہل ہو۔ وکیل کے لیے ضروری ہے کہ اُسے اپنے وکیل بنائے جانے کا علم ہو نیز یہ کہ وکیل اور جس کام میں وکالت کے اختیارات دینے مقصود ہیں، دونوں کو معلوم ہوں۔ وکالت کا ثبوت مؤکل کے اقرار یا گواہوں کی شہادت سے ہوگا۔

وکالت دراصل ایک رضاکارانہ اور بلامعاوضہ معاہدہ ہے جسے محض انسانی اسباب اور معاشرتی حالات کی بنا پر جائز قرار دیا گیا ہے۔ یہ گویا اپنے حق کے حصول کے لیے ایک ضرورت مند کے ساتھ رضاکارانہ تعاون کی ایک شکل ہے جس میں اُجرت اور فیس لینا اس کے بنیادی رُوح کے خلاف ہے۔

یہ کوئی فن یا ہنر بھی نہیں جس کو روزی کمانے کا ذریعہ بنایا جا سکے۔ انھی وجوہ کی بنا پر ردالمختار کے مصنف فرماتے ہیں کہ عقدِ وکالت ایک امانت ہے، جس کو فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اکثر فقہا کی رائے ہے کہ ایک مقرر اور طرفین

(موکل اور وکیل)، کو معلوم اُجرت وفیس پر وکیل بنانا درست ہے۔ اور وکیل جب طے شدہ ذمہ داری کو پورا کر دے تو وہ اُجرت کا حق دار ہے۔ اور اگر اُجرت پہلے طے نہ کی گئی ہو یا بعد میں معلوم ہو کہ عقد وکالت شرعاً فاسد تھا تو وکیل کو عُرفِ عام کے مطابق اس کام کی اُجرت ملے گی۔

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ یہ حقوق میں نیابت جائز ہے۔ ان میں وکالت بھی درست ہے۔ جن چیزوں میں موکل کے لیے کوئی فائدہ یا مصلحت ہو۔ انھی میں اسے اختیارات وکالت استعمال کرنے کا حق ہے۔ اور جس کام میں مؤکل کے لیے کوئی مصلحت نہ ہو۔ وکیل شرعاً ایسے اُمور میں معزول تصور ہوگا۔ اسی بنا پر خالص بدنی عبادات (مثلاً نماز)...... غلام کی آزادی وظہار، لعان میں وکالت جائز نہیں۔

جملہ اُن حقوق کے جن میں نیابت وکالت جائز ہے۔ ایک حقِ خصومۃ ہے یعنی دو آدمیوں میں کسی حق میں تنازع و تکرار۔ چونکہ یہ حق خصومۃ تمام قابلِ نزاع انسانی معاملات کو شامل ہے۔ اس لیے فقہا...... اللہ تعالیٰ نے فریقین مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان تمام متنازعہ اُمور میں وکالت کو جائز قرار دیا ہے، البتہ یہ بات ابتدا میں بھی سمجھ لینے کی ہے کہ وکالت ایک عام چیز ہے، جس کو نیابت کے مفہوم میں ہم لے سکتے ہیں۔ اور یہ تمام معاملات حتیٰ کہ بعض عباداتِ مالیہ یا عبادات مرکبہ میں بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً زکوٰۃ اور حج میں۔ البتہ وکالت بالخصومۃ اس کی ایک قسم ہے جو صرف فریقین میں اختلاف و تنازع کی صورت میں ہوگی۔ اور چونکہ آدمیوں میں تنازعہ و جھگڑا صرف حقوق العباد اور اس کے متعلقات میں ہو سکتا ہے۔ اس لیے تمام عبادات اور حقوق اور وکالت بالخصومۃ سے مستثنیٰ ہوں گے۔ موجودہ عدالتوں میں رائج وکالت فقہائے اسلام کی وکالت بالخصومۃ کی ایک:

تمام فقہاء اسلام اس بات پر متفق ہیں۔ حدود اللہ میں سے حدِ زنا اور حدِ شرب خمر میں ملزم کی جانب سے وکالت درست نہیں۔ اور ان دو حدود میں وکالت

ایک ایسا.......لایعنی کام جس کے باطل ہونے پر اُمتِ مُسلمہ کا اتفاق ہے۔
نیز یہ کہ حد کو ٹالنا اور مجرم کو تحفظ مہیا کرنا ہی نیابت شریعت کے منافی ہے،
اس لیے حدود اللہ تعالیٰ کا حق ہیں اور جب ان کے جرائم کا ارتکاب ہو جائے تو
جائے تو حد کی تنفیذ کے ذریعے حقوق اللہ کی حفاظت ضروری ہوتی ہے اور وکالت
چونکہ ان حقوق میں جائز ہے جو قابلِ نیابت ہوں اور حدود قابلِ نیابت نہیں ہیں۔
فقہ حنفی کی معروف کتاب " بدائع الصنائع" کے مصنّف امام کاسانی رحمۃ اللہ
فرماتے ہیں۔

" جن حدود میں خصومت، فریقینِ مقدمہ کے درمیان زبانی تنازع و تکرار کی
ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً حدِ زنا اور حدِ شرب، ان کے اثبات میں وکالت
درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ حدود قاضی کے سامنے گواہوں کی شہادت یا
ملزم کے اقرار سے ثابت ہو جاتی ہیں خصومت کی ضرورت نہیں ہوتی [1]

تکملۂ فتح القدیر کے مؤلف لکھتے ہیں :" یہ جان لینا ضروری ہے کہ جو لوگ حدود
کے اثبات میں وکالت کو جائز قرار دیتے ہیں، اُن کے نزدیک حدود سے مراد صرف
حدِ قذف اور حدِ سرقہ ہوتی ہے۔ اسی لیے حدِ زنا اور حدِ شرب کے اثبات میں کسی
کو وکیل بنانا باتفاقِ فقہاء جائز نہیں۔ اس لیے کہ ان میں حق العباد نہیں ہے [2]
بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بعض فقہائے سلف فرماتے ہیں کہ ملزم کی جانب سے وکالت
تمام حدود — سرقہ، قذف، حرابہ، زنا، شرابِ خمر — میں جائز نہیں اور ان تمام
حدود کے مقدمات کی تفتیش و تحقیق اور سماعت میں صرف قاضی یا اس کا نائب اور ملزم
شریک ہوں گے۔
فقہاء نے اپنی اس رائے کے لیے ان مقدماتِ حدود کو اساس و دلیل بنایا ہے جو

---

[1] بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۱
[2] تکملہ شرح فتح القدیر ۸/ ۷

عہدِ رسالت نبی کریم کے سامنے پیش ہوئے۔

مثلاً حدِ زنا کے متعلق ایسے مقدمات ملتے ہیں جو موجودہ رائج غیر اسلامی قوانین اور اس کے ماہرین کی نظر میں وکالت کے مستحق تھے۔ لیکن ہمیں کہیں بھی وکالت یا وکیلوں کا وجود نہیں ملتا۔

— ماعز بن مالک اسلمی کا قصہ جو نعیم بن ہزال کی زیرِ پرورش ایک یتیم تھے [۱]

— قبیلہ جہینہ کی حاملہ عورت کا واقعہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "یا رسول اللہ! کیا آپ مجھے بھی اسی طرح لوٹانا چاہتے ہیں جیسے ماعز کو واپس کر دیا تھا، بخدا میرے پیٹ میں — زنا کا — حمل موجود ہے [۲]

— مشہور واقعہ عسیف (مزدور) جب اُس سے زنا کا ارتکاب ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انیس اسلمی کو یہ ہدایت دے کر عورت کی طرف بھیجا کہ اگر وہ اعتراف کر لے تو اس کو "رجم" سنگسار کرنے کی سزا دینا۔

اِن مقدمات پر غور کرنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ عورت اپنی کمزوری اور حیاداری پردہ داری نیز اپنے مقدمہ کی خود پیروی کرنے سے عجز و معذوری کی بنا پر کسی کو اپنا وکیل بنانے کا معقول جواز رکھتی تھی۔ اور وہ یتیم و بے سہارا بچہ جو باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم تھا، اس بات کا سب سے زیادہ مستحق تھا کہ اس کے ساتھ ہمدردی و شفقت اور احسان کا معاملہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ اس سے بڑی اور شفقت کیا ہو سکتی تھی کہ ایک ایسے مقدمہ میں اس کی مدافعت و وکالت کا انتظام کیا جائے جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔

اگر حدِ زنا کے ملزم کی جانب سے وکالت کی گنجائش اسلامی قانون میں موجود ہوتی تو حضورؐ اکرم اس مقدمہ میں عورت کے اعزا یا خاندان کے لوگوں میں سے کسی کو اس

---

[۱] سنن ابوداؤد ۲/۵۶۰ھ

[۲] سنن ابوداؤد ۲/۵۹۰ھ

کی طرف سے وکیل بننے کی ہدایت فرماتے۔ اس لیے کہ اسلام ایسے امور میں پردہ پوشی اور اخفاء کی ترغیب دیتا ہے۔ ایسے ہی ایک خاتون اس بات کی سب سے زیادہ ضرورت مند تھی کہ کوئی اس کا وکیل بن کر اس کی طرف سے دفاع کرے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کتبِ احادیث میں اس آدمی کا قصہ نقل ہوا ہے جس نے ارتکابِ زنا کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں اعتراف کرتے وقت (فریقِ ثانی) عورت کا نام لیا تو آپؐ نے کسی کو بھیج کر تحقیق کروائی، اُس نے اعترافِ جرم سے انکار کر دیا تو آنحضرتؐ نے اقبال کرنے والے پر حد جاری کی اور عورت کو چھوڑ دیا۔

حضرت سہل بن سعد فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضورؐ کے پاس آکر اعتراف کیا کہ اس نے ایک عورت (جس کا اس نے نام لیا) کے ساتھ زنا کیا ہے تو آپؐ نے عورت سے اس بارے میں معلوم کروایا۔ جب اُس نے صاف انکار کر دیا تو آپؐ نے اقرار کرنے والے کو کوڑوں کی سزا دینے کا حکم دیا۔ اور جس عورت کا اس نے نام لیا اُس کو چھوڑ دیا گیا۔[1]

اسی طرح آپؐ نے اس عورت کی طرف جس کے ساتھ ایک گھر میں کام کرنے والے مزدور نے زنا کیا تھا، انیس کو روانہ کیا اور اس عورت کے خاوند کو توجہ میں نہ لائے جو اپنی عزت کی پردہ پوشی، خاندان کو بکھرنے سے بچانے اور ازدواجی زندگی کی بقا کی خاطر اس کی طرف سے وکالت کا حق دار بنتا تھا۔

اِن مقدمات کی رُوداد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اقبال کرنے والے نے اگر فریقِ ثانی کا نام لیا تو آپؐ نے اس سے تحقیق کی۔ اور اگر اعتراف کرنے والے نے کسی کا نام نہیں لیا تو آپؐ نے صرف اعتراف کرنے والے پر حد جاری فرمائی اور مزید کھوج کرید میں پڑنے سے اجتناب کیا۔ قبیلہ جہینہ کی عورت کا واقعہ اس کی واضح دلیل ہے۔ نیز حضرت سہل بن حنیف بعض انصاری صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں، کہ اُن کا

---

[1] سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۶۴

ایک آدمی ہوا اور سخت کمزور ہو گیا۔ دیکھنے سے ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے پاس کسی کی لونڈی گئی، تو وہ اس کے ساتھ زنا کا ارتکاب کر بیٹھا۔ جب اس کے قبیلہ سے کچھ لوگ اس کی عیادت کرنے آئے تو وہ ندامت کے مارے ان کو بتانے لگا کہ میرے معاملہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ ایک سو شاخوں والی جھاڑن لے کر اس کو ایک ہی ضرب مار دی جائے[1]

کہا جاتا ہے کہ یہ پوچھنے والے اس کے وکیل ہی تو تھے۔" حنیف" کے والد بھی اس کی طرف سے اقرار میں وکیل تھے۔ اسی لیے دعوٰی کا انکار کرتے میں بھی وکالت درست ہوگی۔ کیونکہ اقرار اور انکار دونوں دعوٰی کا حصہ ہیں۔

لیکن بنظرِ تامل دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ لوگ اعترافِ جرم کرنے والوں کی طرف سے وکیل نہیں، بلکہ پیغام بر تھے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرعی حکم معلوم کرنے آئے تھے، جسے نافذ کرنا بھی ان کے ذمہ تھا۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ واقعۂ عسیف میں عورت کے شوہر نے اس کا دفاع نہیں کیا۔ اسی طرح قبیلۂ جہینہ کی حاملہ عورت کے متعلق بات جب اس کے اقرار کے بعد مشہور ہو گئی تو کسی نے اس کی پردہ پوشی اور مدافعت کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ دونوں مقدمات میں بظاہر وکالت و دفاع کی سخت ضرورت تھی اور رحمت و شفقت کا تقاضا تھی۔

(باقی)

---

[1] سنن ابوداؤد ج ۲ ص

سمندر میں خواہ کتنے ہی بھٹکتے پھریں، منزلِ مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکتے ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب اللہ سے الگ کر دیجیے تو خدا کا راستہ پانے کے بجائے آدمی ناخدا ہی کو خدا بنا بیٹھنے سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ لہٰذا آئیے ہم دیکھنے کی کوشش کریں کہ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا عکس کس طرح پیش کرتا ہے اور اس مقصد کے لیے جب ہم قرآنِ کریم کی رجوع کرتے ہیں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت و سیرت کے مندرجہ ذیل پہلو پوری طرح نکھر کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

حضورؐ کا منصبِ رسالت سب سے اہم اور بنیادی بات جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت و مقام کے بارے میں قرآن کریم سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اسی طرح کے رسول، جس طرح کے رسول آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی گزر رہے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ

(آل عمران - ۱۴۴)

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں"

رسالت کے ساتھ مقامِ عبدیت دوسری اہم خصوصیت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے بندے بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کا ذکر اہتمام سے کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرہ میں ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ - (البقرہ - ۲۳)

"اور اگر تمہیں اس بات میں کوئی شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، تو اس کی مانند ایک سورۃ ہی بنا لاؤ"۔

اور سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

روشن ہو کر سامنے آگئی، میں اسے جلد از جلد آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتا ہوں، سیدنا مولانا مودودیؒ اپنی کتاب " جماعتِ اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"جہاں عوام الناس کے ووٹوں سے حکمران منتخب کیے جاتے ہوں، وہاں اگر بگاڑ پایا جاتا ہے تو لامحالہ اس کا سرچشمہ چار ہی چیزیں ہوں گی۔

۱- عوام الناس کی بے شعوری اور اخلاقی گراوٹ۔

۲- ایک ایسے با اثر طبقے کی موجودگی جو عوام کی ان کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اقتدار کی مسندوں پر قبضہ جما رہا ہو اور معاشرے میں ایسے متعدد عناصر کی موجودگی جو ان علمبردارانِ شر کے حامی و ناصر ہوں۔

۳- نظم و نسق کی مشینری کا ایسے بے ضمیر اور نافرض شناس کارکنوں کے ہاتھ میں ہونا جو آئین کے حدود توڑ کر انتخابات میں بگاڑ کے علمبرداروں کی مدد کرتے ہیں، اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)
نہیں ٹھونسی جا سکتی۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کے لیے ناگزیر ہے کہ تبلیغ، تلقین اور تفہیم کے ذرائع اختیار کر کے لوگوں کے عقائد و افکار بدلے جائیں، ان کے سوچنے کے انداز بدلے جائیں۔ ان کی اقدار (VALUES) بدلی جائیں، ان کے اخلاق بدلے جائیں۔ اور ان کو اس حد تک اُبھار دیا جائے کہ وہ اپنے اُوپر جاہلیت کے کسی نظام کا تسلط برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں.......... اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام کو عملاً برپا کر دینے کے لیے کوئی اقدام اُس وقت تک نہیں کیا جا سکتا، جب تک اس مقصد کے لیے کام کرنے والوں کو اس نوعیت کی عوامی تائید حاصل نہ ہو جائے۔ (تصریحات - ۲۱۸)

۴ ۔ انتخاب کے طریقِ کار میں ایسی بنیادی غلطیوں کا موجود ہونا جن کی وجہ سے صحیح انتخاب نہ ہوسکتا ہو۔"

ان چاروں اسبابِ خرابی کو اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھ لے تو اُسے اِس امر میں کوئی شک نہ رہے گا کہ جب تک یہ اسباب باقی ہیں قیادت کبھی فساق وفجار کے ہاتھ سے نہیں نکل سکتی ۔ اور صالح نظام کبھی برپا نہیں ہوسکتا۔"

"اصلاح جب بھی کرنی ہو اِس طرح کرنی پڑے گی کہ براہِ راست انتخابات میں دخل دیا جائے ۔ اور پیہم منظم کوشش اور حکیمانہ تدابیر کے ساتھ ان خرابیوں کی جڑیں کاٹی جاتی رہیں۔" (ص ۱۱۶-۱۱۵)

۱۹۵۱ء میں راقم بھی جماعتِ اسلامی کا نمائندہ تھا اور اس کے بعد اکثر انتخابات میں اہم ذمہ داری ادا کرتا رہا ہے ۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ ہم نے انتخابات میں تو باقاعدگی سے حصہ لیا ہے مگر ان خرابیوں کے اسباب یوں واضح ہوکر نہ سامنے آئے اور نہ اُن کو پوری طرح سمجھا ۔

اب جب کہ ہماری پیش رفت اطمینان بخش نہیں ہے اور اس کے اسباب بھی ناقابلِ تردید صورت میں خود سید مودودیؒ کے الفاظ میں سامنے آگئے ہیں تو ہمیں کسی تحفظ اور لیت ولعل کے بغیر ان کے سدباب کے طریقوں پر غور کرنا چاہیے۔

راقم نے ان اسباب کا جو جائزہ لیا ہے وہ پیشِ خدمت ہے ۔

عوام کی بے شعوری اور اخلاقی کمزوریاں | عوام کی سوچوں پر عملاً ابھی تک دین و سیاست کی علیحدگی کا تصور غالب ہے ۔ وہ ابھی تک عبادات کے دائرہ سے باہر کے اُمور میں دین کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے ۔ ان کی نظروں میں "معیاری مسلمان" کا تصور صحابہؓ کی طرح مکمل طور پر اسلامی احکامات پر عمل کرنے والا فرد نہیں، بلکہ ایک خاص عالمانہ وضع قطع یا گوشہ نشین عبادت گزار ہونا ہے [1]

[1] حالانکہ وہ دوسری طرف ایسے لوگوں کو سیاسی رہنمائی و نمائندگی کے قابل نہیں سمجھتے ۔(ن ص)

ان کے لیے اپنے فرقے کے کلامی اور فروعی مسائل کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ انہیں اسلام کے بنیادی اصولوں اور اس کے احکامات کے نفاذ سے برائے نام دلچسپی ہے۔

o۔۔ وہ اسلام کو نظامِ زندگی ماننے لگے ہیں، مگر زندگی کے مسائل کے حل کے لیے سیکولرازم اور سوشلزم کی طرف ہی لپکتے ہیں۔ گویا وہ اسلام کو اپنی مشکلات کا حل نہیں سمجھتے۔

o۔۔ ان کا تصورِ آخرت یہ ہے کہ کلمہ کے زبانی اقرار کے بعد بہشت پر ان کا حق ہے، بس ذرا گناہوں کے بدلے چند روز دوزخ کی سیر کرنی پڑے گی۔ اس لیے وہ خدا اور رسول کے احکامات کی پوری پوری پابندی اور گناہوں سے احتراز ضروری نہیں سمجھتے۔ (بعض تو یہ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ ان کی شفاعت کے لیے منتظر کھڑے ہیں اور وہ ہر کلمہ گو کو جنت میں پہنچا دیں گے۔ نعوذ باللہ)

o۔۔ جائز و ناجائز مفاد کے حصول کے لیے جائز و ناجائز سفارش کرانا اور رشوت سے کام نکلوانا ان کے نزدیک ناگزیر ہے۔

o۔۔ ان کے نزدیک سیاست نام ہے ذاتی، برادری، علاقہ اور طبقہ کے مفادات کی حفاظت۔ اسلام، ملک اور قوم کے مفادات کی پامالی کا احساس بڑی حد تک مفقود ہے۔

o۔۔ زندگی کا مقصد "دنیا" بن گئی ہے۔ آخرت سے محبت اور تعلق برائے نام رہ گیا ہے۔

با اثر طبقے کا اقتدار پر قبضہ انگریزوں نے جن جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور افسر شاہی کی مدد سے ہمیں غلام بنا رکھا تھا، وہی گروہ اقتدار پر قابض ہے وہ عوام کو جمہوریت سے محروم رکھ کر انہیں اسلام سے دور لے جانے میں کوشاں ہے تاکہ نفاذِ اسلام سے اس کے مفادات اور اقتدار کا خاتمہ نہ ہو جائے۔

o۔۔ برسر اقتدار گروہ عوام کو ذاتی، برادری، علاقہ، فرقہ اور طبقہ کے مفادات

کا لالچ دے کر اور ان کو تعصبات میں الجھا کر ان سے ووٹ حاصل کرتا ہے۔

برسراقتدار کے حامی عناصر مفاد پرست چوہدری، سیاسی کارکن، برسراقتدار گروہ کی سرپرستی میں رشوت، دلالی، ناجائز سفارش اور سینہ زوری سے عوام کو قابو میں رکھتے ہیں اور اپنے آقاؤں کی حمایت کر کے انہیں انتخابات میں کامیاب کراتے ہیں۔

د۔ مفاد پرست صحافی، دانشور اور فن کار ذرائع ابلاغ کی مدد سے عوام کو اسلام اور ملت کے حقیقی مفادات سے بے خبر رکھ کر اور طرح طرح کے چکر چلا کر برسراقتدار گروہ کا سیاسی تشخص بڑھاتے ہیں۔

ہ۔ برسراقتدار گروہ کے سیاست دان خواہ اسلام کا نام لیں یا سوشلزم یا سیکولرازم کا، مولوی حضرات کا ایک گروہ ضرور ان کے ساتھ ہوتا ہے تاکہ عوام اسلام اور غیر اسلام میں تمیز ہی نہ کر سکیں۔

افسر شاہی کا مفاد پرست سیاست دانوں کی مدد کرنا افسر شاہی کا وجود اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ وہ انگریزوں کے سامراجی اقتدار کی خدمت اور حفاظت کی خدمات سرانجام دے، آزادی کے بعد ان کا کام ہر جائز و ناجائز طریقہ سے برسراقتدار گروہ کے اقتدار کی حفاظت کرنا ہے۔

ہ۔ افسر شاہی برسراقتدار گروہ کی جائز و ناجائز سفارشیں مان کر عوام میں ان کے اثر و رسوخ کو مستحکم کرتی ہے، انہیں قرضے، پلاٹ، لائسنس، پرمٹ اور مالی مفادات حاصل کرنے اور اپنی مالی حیثیت مستحکم کرنے میں مدد دیتی ہے اور انتخابات میں دھاندلی کرنے میں مددگار بنتی ہے۔

م۔ افسر شاہی مفاد پرست سیاست دانوں کی دعوتوں اور تقریبات میں شریک ہو کر ان کے رعب و دبدبہ میں اضافہ کرتی ہے۔

ہ۔ افسر شاہی اور برسراقتدار گروہ کا گٹھ جوڑ اس حد تک ہو چکا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں کہ بڑی سے بڑی بدعنوانی اور دھاندلی

پر نہ کسی پر مقدمہ چلتا ہے اور نہ کسی کو سزا ملتی ہے۔ یہ سب ایک گروہ ہیں اور خود کو حکمران گروہ سمجھتے ہیں۔ ان کا اختلاف اختیارات حاصل کرنے میں ہے۔ اسلام کا نفاذ روکنے اور عوام کو محروم رکھنے میں متفق ہیں۔

○۔ بلدیاتی انتخابات میں اپنے حامیوں کو، جن کا کام رشوت، دلالی اور سفارش بازی سے عوام کو اپنا ممنون بنا کر ووٹ لینا ہوتا ہے، کامیاب کراتے ہیں اور پھر ان کی مدد سے ضلع، صوبہ اور مرکز کے اداروں کے انتخابات جیتے جاتے ہیں۔

انتخابی طریق کار میں غلطیاں

الیکشن کمیشن کو وہ اختیارات ہی نہیں دیے جاتے، جو منصفانہ اور اسلامی انتخابات کے لیے ضروری ہیں۔

○۔ انتخابی حلقوں کی مستقل حد بندی نہیں کی جاتی۔ ہر انتخابات پر ان میں اپنی مرضی سے ردوبدل کیا جاتا ہے۔

○۔ ووٹر کی شناخت کا اندراج جان بوجھ کر مبہم بنا دیا گیا ہے تاکہ جعلی ووٹنگ کا دروازہ کھلا رہے۔ اگر انگریز کے دور کے طریقے پر ہر ووٹر کا ذات، پیشہ، حلیہ اور شناختی نشان درج ہو تو جعلی ووٹنگ نہیں ہو سکتی۔

○۔ جعلی ووٹر کو چیلنج کرنا مشکل بنا دیا گیا ہے۔

○۔ پولنگ پر ایسے محکموں اور عہدوں کے افسر لگائے جاتے ہیں جن کو آسانی سے دبایا جا سکے۔

○۔ پولنگ کی حفاظت کا انتظام تسلی بخش نہیں ہوتا جس سے پولنگ کا عملہ بے بس ہو جاتا ہے۔

○۔ امیدوار کی نامزدگی کا طریقہ اور معیار انتخاب غیر اسلامی اور غیر جمہوری ہے۔

○۔ اصولی اور جماعتی سیاست کو کمزور کرنے اور اپنی ذات اور مفاد پرستانہ سیاست کو جاری کرنے کے لیے متناسب نمائندگی کا طریقہ اختیار کرنے سے گریز کیا جا رہا ہے۔

اس ساری تفصیل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیدنا مودودیؒ نے جن اسباب کو دُور کیے بغیر انقلابِ قیادت کو ناممکن بتایا تھا وہ ساری خرابیاں نہ صرف موجود ہیں،

بلکہ پہلے سے وسیع اور مؤثر بنا لی گئی ہیں۔

جب تک ان "اسباب" کو سامنے رکھ کر "پیہم منظم کوششوں" اور "حکیمانہ تدابیر" سے ان کا انسداد نہ کیا جائے گا، کامیابی ناممکن نہیں تو نہایت مشکل ضرور ہے۔

اگر ہم انتخابات میں کامیابی چاہتے ہیں تو ہمیں ایسا پروگرام بنانا ہو گا کہ ہم ان تمام اسباب خرابی کو اس حد تک ختم کر سکیں کہ وہ مؤثر نہ رہیں۔ اِس مقصد کے لیے صرف انتخابات میں حصہ لینا ہی کافی نہیں، بلکہ ایک ایسا جامع نقشۂ کار بنانا ہو گا، جو ان تمام مقاصد کو حاوی ہو سکے جو ہماری کامیابی کے لیے ضروری ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ عوام کی فکری اور اخلاقی اصلاح کہ ان کی اکثریت حق کو حق تسلیم کر کے اس کا ساتھ دے سکے۔

۲۔ برسرِ اقتدار گروہ "جاگیردار، سرمایہ دار اور افسر شاہی" کے کردار اور ان کے "حامیوں" کے ہتھکنڈوں کو اس حد تک عیاں کر دینا کہ عوام ان سے دھوکہ نہ کھائیں اور نہ ان کی ترغیبات کا شکار ہوں۔

۳۔ افسر شاہی پر اس قدر عوامی دباؤ ڈالنا اور عدالتی و محکمانہ کارروائیوں سے انہیں بدعنوانی سے روکنا اور باضمیر افسران اور عملہ کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کو تحفظ دینا۔

۴۔ انتخابی طریقۂ کار کی تمام خرابیوں کو دُور کرنا اور ہر موقعہ پر انتخابی خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کرنا، اور عوام کو اس قدر بیدار کرنا کہ انتخابی دھاندلی ممکن ہی نہ رہے۔ (باقی)

قرآن اور حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم

جناب الیف الدین ترابی صاحب

دین کے بنیادی مآخذ دو ہی ہیں، اوّلاً اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید، ثانیاً قرآن کو لانے والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت، اور دین کے یہ دونوں مآخذ باہم لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت کے بغیر قرآن کریم کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور نہ قرآن کے بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت کا صحیح ادراک ممکن ہے، لہٰذا اگر قرآنِ کریم کی سب سے زیادہ مستند اور قابلِ اعتماد تفسیر وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور سیرت کی بھی سب سے مکمل اور دلآویز تصویر وہ ہے — جو قرآنِ کریم کے صفحات پر بکھری ہوئی ہے اور اگر قرآن کریم کی دعوت اور پیغام کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سنت کو پوری طرح سامنے رکھا جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام اور پیغام کو سمجھنے کے لیے بھی اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ خود قرآنِ کریم میں حضورؐ کی کیا تصویر سامنے آتی ہے۔ قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت کے درمیان پائے جانے والے اس اختصاصی تعلق کو عالمِ اسلام کے ایک ممتاز مفکر نے ایک بڑی خوب صورت مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ کتاب کو نبی سے الگ کر دیجیے تو وہ ایک کشتی ہے ناخدا کے بغیر، جسے لے کر اناڑی مسافر زندگی کے

سمندر میں خواہ کتنے ہی بھٹکتے پھریں، منزلِ مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکتے ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب اللہ سے الگ کر دیجیے تو خدا کا راستہ پانے کے بجائے آدمی ناخدا ہی کو خدا بنا بیٹھنے سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ لہٰذا آئیے ہم دیکھنے کی کوشش کریں کہ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا عکس کس طرح پیش کرتا ہے اور اس مقصد کے لیے جب ہم قرآنِ کریم کی رجوع کرتے ہیں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت و سیرت کے مندرجہ ذیل پہلو پوری طرح نکھر کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

حضورؐ کا منصبِ رسالت سب سے اہم اور بنیادی بات جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت و مقام کے بارے میں قرآن کریم سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اسی طرح کے رسول، جس طرح کے رسول آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی گذر رہے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ

(آل عمران - ۱۴۴)

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں"

رسالت کے ساتھ مقامِ عبدیت دوسری اہم خصوصیت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے بندے بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کا ذکر اہتمام سے کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرہ میں ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۔ (البقرہ - ۲۳)

"اور اگر تمہیں اس بات میں کوئی شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، تو اس کی مانند ایک سورۃ ہی بنا لاؤ"۔

اور سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا - (بنی اسرائیل - ۱)

"پاک ہے وہ جو لے گیا رات کے وقت اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک"۔

رسول بھی اور انسان بھی قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انسان ہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کا طرزِ استدلال ملاحظہ ہو۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَھُمُ الْھُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔ قُلْ لَّوْ کَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِکَۃٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْھِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَکًا رَّسُوْلًا ۔ (بنی اسرائیل ۹۴-۹۵)

"نہیں روکا لوگوں کو کسی چیز نے اس بات سے کہ وہ اللہ کی طرف سے آنے والی ہدایت پر ایمان لائیں۔ مگر ان کی اس بات نے کہ کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ ان سے کہو کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے۔ تو ہم یقیناً ان کے لیے آسمان سے کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے"۔

نبی اُمّی — ایک امتیازی شان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بہت بڑا وصف جو قرآنِ کریم نے ہمیں بتایا ہے یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے، اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ کا رسول ہونے کا ایک بہت بڑا اور ناقابلِ انکار ثبوت ہے۔ کیونکہ جو شخص لکھنا پڑھنا تک نہیں جانتا، وہ آخر وحی الٰہی کے بغیر کسی طرح قرآن جیسی لاجواب کتاب اور اسلام جیسا مکمل دین پیش کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وصف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ

وَكَلِمَاتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (الاعراف - ۱۵۸)

"پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر، جو اللہ اور اس کی تعلیمات پر ایمان رکھتا ہے، اور پیروی کرو اس کی، تاکہ تم راہ راست پالو"

شانِ رحمۃ للعالمین قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ سورہ الانبیاء میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (الانبیاء - ۱۰۷)

"اے نبیؐ، ہم نے تم کو تمام دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے"۔

سورۂ سبا میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا

(سبا - ۲۸)

"اور اے نبیؐ، ہم نے تم کو تمام دنیا والوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے"۔

مزکّی بھی اور معلّم بھی قرآنِ مجید ہمیں بتاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کام اہلِ ایمان کا تزکیہ اور ان کی تعلیم و تربیت ہے اور یہ کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارِ رسالت کا ایک حصہ ہے۔ سورہ الجمعہ میں ارشاد ہوتا ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

(الجمعہ - ۲)

"وہی ہے جس نے اُمیّوں میں ایک رسول خود انہی میں سے اُٹھایا جو انہیں اس کی آیات سُناتا ہے۔ ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔

(باقی)

رسائل و مسائل

تدفین سے پہلے فاتحہ اور دعائے مغفرت

سوال:- ایک مسئلے کی وضاحت قرآن و حدیث کی روشنی میں مطلوب ہے۔ توجہ فرمائیں، مشکور ہوں گا۔

ہمارے ہاں آبا و اجداد سے یہی مستقل رواج چلا آ رہا ہے کہ بعد المرگ جب تک مرنے والے کو باقاعدہ تکفین و تجہیز کر کے اُسے دفن نہ کر دیا جائے اُس پہ فاتحہ نہیں پڑھی جاتی۔ یعنی موت کی خبر سُن کر لوگ جمع تو ہو جاتے ہیں اور باہم مل کر بیٹھ جاتے ہیں مگر ایصال ثواب کے لیے فاتحہ یا دُعائے مغفرت نہیں کرتے۔ یہ عمل صرف دفن کرنے کے بعد شروع ہوتا ہے اور دو یا تین دن جاری رہنے کے بعد تیسرے دن قُل تک رہتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ پروازِ رُوح کے فوراً بعد ایسا کیوں نہیں کیا جاتا جبکہ ایصالِ ثواب کا تعلق صرف رُوح سے ہوتا ہے۔ کیا کوئی حکم مانع ہے یا یونہی رواجاً ایسا ہوتا ہے۔ آجکل میت بذریعہ ہوائی جہاز بیرونِ مُلک سے لا کر آبائی قبرستانوں میں دفن کرنے میں بعض اوقات دو تین ہفتے بھی لگ جاتے ہیں۔ اس تمام عرصہ میں فاتحہ نہیں پڑھی جاتی۔ جب نعش پہنچ جاتی ہے اور اُسے سپرد خاک کر دیا جاتا ہے۔ پھر یہ عمل دو یا تین دن تک جاری رہتا ہے ایسا کس حکم کے تحت کیا جاتا ہے۔ یہی رواج اُس وقت بھی اپنایا جاتا ہے جب کہ مرنے والے کی نماز جنازہ متعدد مرتبہ کسی دوسرے مقام پر پہلے بھی ادا ہو چکی ہوتی ہے۔ سوال کی اہمیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے جب کہ

ایسا رواج صدیوں پہلے ہمارے اُن اجداد سے چلا آرہا ہے، جو یقیناً دینِ خداوندی کو ہم سے نہ صرف بہتر جانتے تھے، بلکہ اس پر عمل بھی فرماتے تھے۔ ہمارا تعلق ساداتِ خوارزمی خاندان سے ہے۔

جواب: سوال کا جواب یہ ہے کہ میّت کے فوت ہونے کے بعد میّت کے ورثا اس کے کفن دفن میں مصروف ہوتے ہیں، اس لیے انھیں کسی دوسرے کام میں مصروف کرنا مناسب نہیں ہے۔

نیز میّت کی جدائی کا پورا غم بھی دفن کر دینے کے بعد ہوتا ہے۔ اس لیے افضل یہی ہے کہ تعزیت میّت کو دفنانے کے بعد سے تین دن تک کی جائے۔ آج کل فاتحہ کی مروجہ شکل دراصل تعزیت ہے۔

اس لیے مروجہ فاتحہ میّت کو دفن کر دینے کے بعد کرنا چاہیے۔ "وھی بعد الدفن افضل منھا قبلہ لان اھل البیت مشغولون قبل الدفن بتجھیزہ ولان وحشتھم بعد الدفن لفراقہ اکثر وھذا اذا لم یر منھم جزع شدید والا قدمت لتسکینھم۔ (حوالہ رد المحتار جلد دوم ص ۲۴۱)

محض دعا کرنا پہلے بھی جائز ہے۔ اُمِ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ جب ابوسلمہؓ فوت ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے۔ اُن کی آنکھیں کُھلی تھیں تو آپؐ نے بند فرما دیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ جب روح قبض ہوتی ہے تو آنکھیں اُسے جاتا ہوا دیکھتی ہیں اس لیے کُھلی رہ جاتی ہیں۔ پھر آپؐ نے اُن کے لیے دعا فرمائی۔ اَللّٰھم اغفر لابی سلمۃ (بحوالرائق ص ۱۸۳ جلد ۲)

پس آپ کے بزرگوں کا طریقہ صحیح تھا، اسی کو جاری رکھیں۔ میّت اگر باہر سے دیر سے لائی جا رہی ہو تو ایسی صورت میں تعزیت دفن سے پہلے بھی کی جا سکتی ہے۔

(عبدالمالک)

مطبوعات

الاؤ اور پھوار | افسانوں کا مجموعہ۔ از محترمہ اُمِ زبیر۔ ناشر مؤلفہ خود ہیں۔ پریس کا پتہ تو درج ہے، مگر کتاب کے ملنے کا پتہ درج نہیں۔ دبیز آرٹ پیپر کا سرورق، سادہ رنگین ڈیزائن۔ قیمت: ۴۰/- روپے

محترمہ اُمِ زبیر کے افسانے پڑھ کر خیال آیا کہ اگر طباعت سے پہلے انہیں دیکھتا تو مصنفہ سے کہتا کہ آپ میری دو تین کتابیں (مطبوعہ نہ سہی، غیر مطبوعہ) مجھ سے لے لیں اور یہ مجموعہ مجھے عنایت فرما دیں۔ مگر ایک چیز ایسی ہے کہ جس کے آثار مٹائے نہیں جا سکتے۔ اس مجموعے میں ایسی بہت سی علامات ہیں، گھریلو مسائل اور ازدواجی نفسیات کے ایسے تجزیے ہیں جو صاف بتا دیتے ہیں کہ یہ کسی خاتون کی تحریر ہے۔ بعض باتوں کو کوئی مرد اس طرح بیان ہی نہیں کر سکتا جیسے اُمِ زبیر نے بیان کی ہیں۔

عجیب بات ہے کہ پیش لفظ لکھنے والی بہن نے نام کو ایسے مخفی رکھا ہے جیسے خدا پرست خواتین سر سے پیر تک اپنے جسم کو غیر مردوں کی نگاہوں سے محفوظ رکھتی ہیں۔ پیش لفظ میں بڑی کام کی باتیں ہیں۔ مگر میرے ذاتی رجحان کے مطابق ہم اور اُمِ زبیر جو ادبی کام کر رہے ہیں وہ جماعتِ اسلامی نام کی پارٹی کے حوالے سے نہیں، بلکہ خود اسلام کے حوالے سے حوالے سے ہے۔ ہماری کمٹ منٹ اسلام سے ہے جو ابدی ہے۔ اسلام کی خادم شخصیتیں اور جماعتیں بدلتی اور مٹتی رہتی ہیں، اور وہ غلطیاں بھی کر سکتی ہیں یا بعض لوگ ان سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اُمِ زبیر کی کہانیوں کی ساخت اور بافت اسلامی شعور حیات کے سانچے میں جذبات و واقعات کے تار و پود سے ہوتی ہے۔ ان کی کہانیوں کا سلسلہ

علّت و معلول اور انتاج و انجام خیر و شر کی رزم کے مناظر اس طرح دکھاتا ہے کہ انسانی فطرت کی وہ معروف آفاقی قدریں روشن ہو جاتی ہیں، جو اسلام کا سب سے بڑا عطیہ ہیں۔

بہن اُمِّ زبیر صاحبہ کی کتاب کو مجھ تک آتے بہت دیر ہوئی۔ بجا طور پر ان کو مجھ پر بہت دعویٰ داعیہ بھی ہے۔ مگر میری بہت سی مجبوریاں مجھے بروقت کام کرنے سے روکتی ہیں۔ ان کی فرمائش تھی کہ میں کم سے کم ان کی ایک کہانی "الاؤ اور بچھوا" ضرور پڑھ لوں۔ مگر شاید اس مشورے میں کوئی حکمت پنہاں تھی کہ میں ساری کتاب ایک ہی نشست میں پڑھ گیا۔ اور میں نے دل میں کہا کہ ہماری طرف سے شاید کہانیوں کا یہ پہلا مجموعہ ایسا آیا ہے کہ ہم اسے ہر کسوٹی پر پرکھنے کے لیے صیرفیوں کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ سرریلزم اور علامتی کہانیوں کے لیے جو معمائی کاوشیں درکار ہیں، ان کی توقع ہمارے معاشرے کے مٹھو ڑے سے قارئین کی ۵، ۷ ٪ تعداد سے نہیں کی جا سکتی۔ اصل میں وہ چیزیں ادیب ادیبوں کے لیے لکھتے ہیں۔ یہ کہانیاں تمام متوسط درجے کے کثیر التعداد قارئین و قاریات کے پڑھنے کے لیے لکھی گئی ہیں۔

اس کتاب کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ کسی کہانی میں تصنع اور نظریاتی ٹھونسم ٹھانس ذرا بھی نہیں ہے۔ پلاٹ، واقعات، کردار، کہانی کا آغاز اور اختتام بہت خوب ہیں۔ ان میں تقسیم برصغیر کے سانحات بھی جھلک رہے ہیں، مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے وقت کا نقشہ بھی ہے، جہادِ افغانستان کے مناظر بھی، اور عام معاشرتی زندگی میں دولت اور اچھے اخلاقی رویوں کی کشاکش بھی۔ ساری کہانیوں میں مشترک عمل یہ ہے کہ مجموعے کا پورا ہنڈولا عورت کے گرد گھوم رہا ہے۔ شوہر کے لیے مصیبتیں جھیلتی ہوئی عورت، بچوں کے لیے قربانی دیتی ہوئی عورت، دولت کے بوجھ سے کچلی ہوئی عورت، شکست خوردہ مرد کو حیاتِ نو دیتی ہوئی عورت، عورت سے متصادم عورت، متکبر عورت اور پھر عاجز ہو جانے والی عورت۔ گویا سارے ہنگامے اسی "فتنے" کے دم سے ہیں، یہ نہ ہوتی تو ایسا سناٹا ہوتا جیسے وادی میں بہت سے پتھروں کے پڑے رہنے کے باوجود ہوتا ہے۔

"منزل تک" (ص ۱۵۸) میں لمبی تقریر آگئی ہے۔ حالانکہ دو جملوں سے کام

چل سکتا تھا۔ "مجازی خدا" والی بات (ص ۲۰۸) سمجھ میں نہ آئی جس کی خاطر یہ فقرہ بھی گیا اور بال بھی ختم۔ اصلی خدا تو اوجھل ہی ہو گیا۔ "بات سوچنے والی بھی نہیں" (ص ۱۳۱) کیا یہاں بات اسمِ فاعل ہے؟ "گرم گرم چائے" اور "گرم گرم قہوہ" — یہ ایک ہی طرز کی بات شاید ہفتے میں دو تین بار پڑھنے میں آتی ہو گی۔ دل اُکتا گیا ہے۔ آیا یہ پھیری والے کی آواز ہے؟ آخر کوئی کردار صرف ایک دفعہ گرم کیوں نہیں کہتا، کوئی کردار یہ نہیں کہتا کہ دیکھنا ذرا تیز گرم نہ ہو۔ یہ فقرہ تو اس طرح کلیشے بن گیا ہے جیسے کچھ عرصہ تک "صلیب" اور "صلیب اُٹھانا" اور "اپنی صلیب آپ اُٹھانا" کی تکرار اتنی ہوئی کہ دل اس لفظ سے اُوب گیا۔ ممکن ہے کہ کچھ مشنریوں نے اس "علامت" کو پھیلانے کا انتظام کیا ہو۔ مگر عوام کا ذہن کھٹک گیا۔

۵۰ صفحے کی پہلی کہانی بہت بڑی قربانی کی آئینہ دار ہے اور ایک نوجوان کے ذہنی بگاڑ کا سبب سامنے لاتی ہے۔ ارم کا قصہ "جب اُسے ہوش آیا تو بڑا عبرتناک ہے۔ محسن اور سعیدہ کی کہانی میں حالات کی بساط اُلٹ کر معاملات کو سنوار دیتی ہے۔ کیا شاندار کردار ہے محسن کا۔ "بت" پگلی ایک اچھوتے موضوع پر نئے طرزِ عمل کی آئینہ دار ہے۔ آخری کہانی تو گویا سنگلاخ وادی کو طے کرنے کے بعد انجام بخیر کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ بھرتی کی کوئی بھی چیز نہیں۔

چار سو باکمال خواتین | از جناب طالب الہاشمی۔ ناشر: بیت اسلامک پبلشرز، اُردو بازار لاہور۔ صفحات: ۴۱۲۔ سفید کاغذ۔ مجلد مع رنگین گرد پوش۔ قیمت: ۱۲۰/ روپے

محب گرامی طالب الہاشمی ایک عرصے سے تاریخ کی کان کنی میں مصروف ہیں اور برابر ہیرے جواہرات برآمد کر کے قوم کو بخش کر رہے ہیں۔ صحابہ کرامؓ اور صحابیاتؓ کے علاوہ تاریخ کی کتنی ہی درخشاں شخصیتوں کی زندگی، فروزاں داستانیں وہ ہم تک پہنچا چکے ہیں۔ ان کی کتابوں کو پڑھیے تو اندازہ ہو گا کہ صحابہ و صحابیات کے احوال کے ضمن میں وہ سیرتِ نبویؐ کے بڑے بڑے اہم گوشے سامنے لے آتے ہیں۔ اسی لیے دیگر اکابر

کے حالات کے ساتھ تاریخ خود بخود شامل ہو کے آجاتی ہے۔
ابھی انھوں نے "تاریخ اسلام سے متعلق ۴۰۶ باکمال خواتین کے احوال لکھے ہیں اور ہمیں محسوس کرایا ہے کہ ہمارے طبقۂ نسواں نے بھی ہماری تاریخ عروج و زوال میں وافر حصّہ ادا کیا ہے۔ دراصل انھوں نے چودہ صدیوں کا سفر اس طرح کیا ہے کہ تاریخ فرشِ قرطاس بچھاتی گئی اور پلکوں اور نگاہوں کو ٹُکاٹُک کر ہاشمی صاحب نے لمبا سفر طے کیا۔ اب پڑھنے والوں کو بھی یہی کرنا ہو گا۔ اس میں دین، دانش، ادب، غداری، شجاعت، خدمت اور وفاداری، غریب پروری کی بڑی شاندار مثالیں ملیں گی۔ پیش لفظ ہمارے فاضل بزرگ ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی فاضل اسلامیات کے قلم سے ہے۔
حضرت فاطمہ بنت حسین (شہید کربلا) "دھاگے کی گرہوں پر تسبیح پڑھتی تھیں" (سند؟ دلیل؟) (ص ۴۵)۔ حضرت عائشہؓ نے اپنی بھتیجی کے سر سے باریک دوپٹہ اتروا کر گاڑھے کا دوپٹہ اوڑھایا۔ کیا اعلیٰ اسوہ ہے (ص ۴۹) سکینہ بنت حسینؓ (شہید کربلا) شاعری و موسیقی و فیشن کی استاذ تھیں اور ان کے گرد لوگوں کا جمگھٹا رہتا۔ (ابتداء۔ ص ۶۳) ان فضول افسانہ طرازیوں کی اچھی طرح جڑ کاٹنی چاہیے تھی۔ حضرت رابعہ کے حالات غیر یقینی ہیں (ص ۱۰۸) تحقیق کی ضرورت ہے۔ ملکہ خیزران کا شوہر سے سلوک بڑا سبق آموز ہے۔ (ص ۱۳۵) دُودھ بلونے کے آلے کے لیے "مخفقی" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسے منتھانی، رئی اور بلونی بھی کہتے ہیں (ص ۱۴۹) ملکہ زبیدہ نے وفور دین کا توڑ سخت عبادات، انفاق اور خدمات سے کیا۔ خوب مثال ہے (ص ۱۵۰) نہر زبیدہ کا بے مثال کارنامہ جس کی تجدید و تکمیل زبیدہ ثانی، شہزادی فاطمہ خانم نے نہر کی صفائی، تجدید اور تکمیل کر کے اسے مکہ تک پہنچا دیا۔ (ص ۴۲۶)۔ ایک لفظ "محفّہ" استعمال کیا گیا ہے۔ منی پالکیاں، ڈولے۔ (ص ۲۱۶) پھر صفحہ ۳۸۵ پر اسی معنی میں لفظ "محافہ" استعمال کیا گیا ہے۔ المنجد کے رُو سے حَفَّ القوم حولہ واحفظوہ۔ نیز حَفَّفَہٗ (احاطہ کرنا) مزید یہ کہ اُحْفَفَ الْقَوْمُ بِہٖ (احاطہ کرنا اس سے مشتق ہے۔ اَلْمِحَفَّہ۔ (عورتوں کی پالکی) و دیگر معانی) ایسے الفاظ کو تفصیلی اعراب کے ساتھ دینا چاہیے اور حوالہ بھی۔

چھٹی صدی ہجری کے وسط میں نور الدین زنگی گذرا ہے۔ بیوی نے دکھڑا رویا کہ گذر بسر نہیں چل رہی، جب کہ بے شمار مال آتا جاتا ہے۔ سلطان نے جواب دیا یہ مسلمانوں کا مال ہے، میں صرف خزانچی ہوں، اس میں سے اپنے لیے کچھ نہیں خرچ کر سکتا۔ (ص ۲۳۶) کاش کہ آج بھی کہیں کوئی ایسی مثال ملتی! مصر میں شجرۃ الدر کی نسوانی حکومت کو خلیفۂ بغداد نے نامنظور کر دیا۔ (ص ۲۶۹) دلّی کی ملکہ بی بی راجی کی تعمیرات میں خواتین کی درس گاہ بھی شامل تھی۔ (ص ۳۴۰) قرۃ العین طاہرہ کے حالات کے ساتھ بابی مذہب کے گمراہ کن عقاید بیان کیے گئے ہیں۔ ضرور پڑھیں۔ (ص ۳۴۵) فاطمہ بنت عبداللہ (بحوالہ اقبال) کے حالات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ (ص ۵۹۲) خالدہ ادیب خانم کے تذکرے میں ان کی فکری کجی کو واضح نہیں کیا گیا۔ (ص ۶۴۰)

عطیہ فیضی کی قابلیت کے ساتھ یہ کمزوری لگی تھی کہ وہ اپنی علمی و ادبی برتری کے ساتھ نسائی حسن کو ملا کر ذہین لوگوں سے کھیلتی تھی۔ اس کا ثبوت اس کی شادی کے بعد اپنے شوہر فیضی رحمین سے تحقیر آمیز سلوک ہے جو بڑا آرٹسٹ تھا۔ (ص ۶۵۳) مجھے خوشی ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی والدہ ماجدہ جیسی عظیم خاتون کا تذکرہ محفوظ ہو گیا (ص ۶۵۸) اسی طرح آپا حمیدہ بیگم کے حالات بھی درج ہو گئے۔ (ص ۶۸۹)۔ افسوس کہ یہ ممکن نہ ہوا کہ مادرِ ملت اور والدۂ محمد علی جوہر کی طرح کی کئی ہستیوں کا ذکر کیا جا سکے۔ صرف بات ان کی آئی جن کے حالات سے کوئی خاص امر وابستہ تھا

اب کتاب کی کوتاہیاں بھی لیجیے۔ سوال یہ ہے کہ محمدی بیگم جیسی تاریخی شخصیت کو کیوں چھوڑ دیا گیا، اس کے ذکر سے تو قادیانیت کی تاریکیاں واضح ہوتی رہتیں۔ پھر پاکستان میں "تحریک آزادی و ترقی نسواں" کی بڑی بڑی لیڈرانیوں کو، مثلاً بیگم رعنا لیاقت علی خاں (ہر دو مرحوم) اور بلبل چوہدری کے نام تو ان اقوال اور کارناموں کے ساتھ محفوظ رہنے چاہییں تھے۔ اسی طرح آج کی عاصمہ جیلانی اور مہناز رفیع اور بے نظیر بھٹو کے علاوہ ادبی پہلو سے نیر بانو، سلمیٰ یاسمین نجمی، اُمّ زبیر، صوفیہ رفعت کے ساتھ کشور ناہید، ادا جعفری (بدایونی)، اور پروین شاکر

الطاف فاطمہ کا ریکارڈ بھی رکھنا چاہئے تھا۔

کتاب بہت دلچسپ ہے۔ کتاب حوالہ بھی ہے مضمون نگاروں، صحافیوں، اساتذہ و طلبہ اور خواتین کے لیے خاص طور سے مفید ہے۔ ۴۰۶ خواتین کی ایک فہرست تاریخی ترتیب سے ہے، دوسری میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے نام درج ہیں۔ ہر تذکرے کے ساتھ حوالہ درج ہے۔ اگر چار سو پر ۴۰۰ کا ہندسہ نہ لکھا جاتا تو ہم یوں پڑھتے کہ "چار سو باکمال خواتین" ہیں ــــ اور کچھ بھی نہیں!

قرآنِ حکیم ــــ پارۂ عم | سید شبیر احمد ۱۳ ــ اے ــ II ــ ایجوکیشن ٹاؤن، وحدت روڈ لاہور۔ فون: ۴۴۲۵۸۵ ناشر: رضیہ شریف ٹرسٹ، ۶ ۴۴۴ شادمان کالونی، لاہور۔ فون: ۴۱۲۱۰۳ ــــ ۴۱۹۳۸۳ ۔تقسیم فی سبیل اللہ ہے۔ اگر اس سلسلے کی توسیع کے لیے کچھ حضرات تعاون کرنا چاہیں تو اندازاً لاگت فی نسخہ ۱۵/ روپے کے حساب سے مدد کر دیں۔

مولینا سید شبیر احمد صاحب پہلے اپنے خاص طرز پر مرتب کر کے پارہ الم پیش کر چکے ہیں جو بہت مقبول ہوا۔ اب پارۂ عم مزید بہتر انداز سے مرتب وشائع کیا گیا ہے ــــ سید صاحب کا یہ تجربہ بالکل نیا اور مفید ہے کہ عربی سے اُردو میں ترجمہ کرتے ہوئے دونوں زبانوں کے الفاظ اور جملوں کی ترتیب مختلف ہوتی ہے۔ یعنی وہ آگے پیچھے ہوتے ہیں۔ اس کا حل مولانا نے یہ نکالا ہے کہ عربی کے کچھ الفاظ یا کلمات کا رنگ نیلا اور کچھ کا سُرخ رکھا ہے۔ ان کے ترجمے میں بھی سُرخ عبارت کا ترجمہ اُردو میں سُرخ رنگ میں ہوگا اور نیلے رنگ کے الفاظ کا ترجمہ نیلے رنگ میں ہوگا۔ اس طرح غیر عربی دان آدمی یا عربی سیکھنے کا خواہش نہایت آسانی سے دونوں زبانوں کی ترتیبِ عبارت کی پیچیدگی سے آزاد ہو کر کسی بھی حصے کے ترجمے کو اُردو میں الگ پہچان سکے گا۔ ابھی آگے وہ مزید مفید کام کرنے والے ہیں۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

فروری ۱۹۹۰ء

جاری کردہ: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ ترجمان القرآن

رودادِ اجتماعِ عام

- افتتاحی خطاب
- کلیدی خطاب
- خطاب جلسہ عام
- اختتامی خطاب

قاضی حسین احمد
امیر جماعت اسلامی

اعلامیہ

رپورٹ جماعت اسلامی پاکستان
۸۳ء — ۸۹ء

اجتماعِ عام نمبر ۸۹ء

اشاعت فروری ۹۰ء

دیگر تقاریر:

- دروس قرآن وحدیث
- ایمان اور دعوت وجہاد
- رُحَمَاءُ بَیْنَهُمْ
- پاکستان میں جماعت کا کردار
- خواتین کا کردار
- نوجوانوں کا کردار
- ہم کیا معاشی تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں؟
- بین الاقوامی مندوبین

ٹائیٹل دیدہ زیب

کتابت کمپیوٹرائزڈ

ضخامت غیر معمولی

قیمت:

مقررین

- مولانا جان محمد عباسی
- پروفیسر غفور احمد
- چودھری رحمت الٰہی
- پروفیسر خورشید احمد
- خرم مراد
- مولانا گوہر رحمٰن
- مولانا فتح محمد
- مولانا عبدالحق
- حافظ محمد ادریس
- لیاقت بلوچ
- سید منور حسن

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ - اردو بازار لاہور

فون: ۳۲۴۴۶۸ — ۶۸۶۳۶ ○ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۴۳